عام رنگ سے مختلف ہے، اور محض خیال آرائی کے بجائے ان مین بیشتر کسی نہ کسی حقیقت کی ترجمانی
گئی ہے، خاص تغزل کا رنگ بھی ستھرا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ مصنف کی کہنہ مشقی کا نمونہ
ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

اقوال اشرف مرتبہ جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ
کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ اقبال بک ڈپو پٹنہ،

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، دینی و اخلاقی فوائد، اور دنیوی و اخروی فلاح
سعادت کا گنجینہ ہین، لائق مرتب نے اس کتاب مین مذہبی و روحانی تعلیمات، ظاہری و باطنی و معا
اصلاح اور عارفانہ حقائق و معارف وغیرہ سے متعلق حضرت مولانا کے تین سو منتخب ملفوظات
ہین، یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن فائدہ کے لحاظ سے ضخیم کتابون پر فوقیت رکھتا ہے، کتاب کے
مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر سوانح اور ان کے
اور کارنامون پر تبصرہ ہے،

رسولِ عربی از جناب سید فرید الوحیدی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت
وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ قومی کتاب گھر دیوبند،

اس کتابچہ مین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بچون کے لئے آسان زبان مین سوانح نبوی
سیرت پاک کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہین، اور ہر سبق کے متعلق مشقی سوالات بھی دیدئے گ
ہین، کتاب بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۹ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۲ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

گلزار ابراہیم و خوانِ خلیل	ڈاکٹر نذیر احمد ایم اے پی، ایچ ڈی، ڈی لٹ، لکھنؤ یونیورسٹی،	۱۶۵-۱۹۲
زبان کے دعویدار	نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی	۱۹۳-۲۰۲
روحانی دنیا	جناب عبدالماجد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز بہار پٹنہ،	۲۰۳-۲۱۵
استانبول کی موتمر مستشرقین عالم	ڈاکٹر محمد حمید اللہ- پیرس	۲۱۶-۲۲۸
حضرت مفتی عنایت احمد رحمۃ اللہ علیہ اور بریلی کا کتب خانہ،	از مولانا سید بدر الدین صاحب استاذ عربی مسلم یونیورسٹی،	۲۲۹-۲۳۶
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۲۳۷-۲۴۰

شذرات

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے قرآن پاک کے اُردو ترجمہ و تفسیر کا شائقین کو مدت سے انتظار تھا، اب اُس کا پہلا پارہ تاج کمپنی لاہور کی طباعت کے روایتی حسن و نفاست کے ساتھ چھپ کر شائع ہو گیا ہے، اردو میں اول تو تفسیریں ہی بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ تمامتر پرانے مذاق کی جن سے جدید تعلیم یافتہ خصوصاً غیر مذہبی طبقہ کی تشفی نہیں ہوتی، مولانا ابوالکلام کا ترجمان القرآن اس مقصد کے لئے مفید ہو سکتا تھا، مگر وہ تشریحی ترجمہ ہے مستقل تفسیر نہیں، اس میں صرف کہیں کہیں تفسیری حواشی ہیں، اس لئے اردو میں ایک ایسی تفسیر کی بڑی ضرورت تھی، جو جدید و قدیم دونوں طبقوں کے تقاضوں کو پورا کر سکے، مولانا عبدالماجد صاحب کی نظر اسلامی اور مغربی دونوں علوم پر ہے، اور وہ دونوں طبقوں کے مذاق سے آشنا ہیں، اسلئے اس تفسیر میں ان تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا ہے،

اگرچہ ابھی اس تفسیر کا ایک ہی پارہ شائع ہوا ہے، مگر اس نمونہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں وہ تمام معلومات و مباحث موجود ہیں، جو تفسیر کے لئے ضروری ہیں، ان کے علاوہ بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اردو کیا عربی کی تفسیروں میں بھی کم مل سکتی ہیں، قرآن مجید میں عبرت و بصیرت، توحید خالص اور دین صحیح کی تعلیم و تبلیغ کے لئے بہت سی قدیم قوموں، مذہبوں، انبیاء و رسل، اور اُن کی اُمتوں کے سبق آموز واقعات اور مختلف و اعلام مذکور ہیں، جن کی تفسیر کے لئے اُن کی تاریخ و جغرافیہ سے واقفیت ضروری ہے، اگرچہ ہمارے قدیم مفسرین نے بھی ان کی جانب توجہ کی ہے، مگر اُن سے متعلق روایات میں انھوں نے حدیث کی طرح نقد و جرح سے پوری طرح کام نہیں لیا ہے، اس لئے اُن کی تفسیروں میں اسرائیلی قصص و حکایات بھی شامل

ہو گئے ہیں، اور اس زمانہ میں چونکہ علم و تحقیق اور تاریخ و جغرافیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، اس لئے وہ تاریخی پہلو سے قصص قرآنی کی تفسیر و تاویل میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے، اور غیر معتبر اسرائیلی روایات پر اعتماد کی وجہ سے مخالفین اسلام کو قرآن مجید پر اعتراضات اور اس کے متعلق غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل گیا،

مولانا عبدالماجد صاحب جدید علوم سے بھی واقف ہیں اس لئے انھوں نے قرآن مجید کے تاریخی حصہ کی تفسیر میں اسلامی ماخذوں کے ساتھ خود ان قوموں اور ملتوں کی مذہبی و تاریخی کتابوں عام تاریخ و جغرافیہ جدید علمی اثری تحقیقات مغربی مصنفین کی تصانیف وغیرہ جدید ماخذوں سے بھی کام لیا ہے، اور ان دونوں کی روشنی میں تفسیر کی ہے جس سے نہ صرف بعض تاریخی اشکال، اور قرآن مجید پر مخالفین کے اعتراضات دور ہو جاتے ہیں بلکہ خود ان اقوام و مذاہب کی افسانوی روایات اور اُن کی مذہبی تصحیفات کی بھی تصحیح ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ قرآنی احکام و تعلیمات کے حکم و مصالح کی تشریح، دوسرے مذاہب سے اُن کے موازنے، مخالفین کے اعتراضات کے جوابات اُن کے قلم سے اسلام کی حقانیت و صداقت کے اعترافات اور اس قبیل کے دوسرے اہم امور کا بھی لحاظ رکھا ہے، ان خصوصیات کے اعتبار سے اردو میں یہ پہلی تفسیر ہے، جو قرآنی اور دینی روح کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے، علمی اصول سے لکھی گئی ہے، اور اس حیثیت سے وہ نہ صرف مسلمانوں کے تمام طبقوں بلکہ غیر مسلموں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے، اس تفسیر کا ایک ایک پارہ بالاقساط شائع ہو گا اور تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور و کراچی سے ملے گا، قیمت تحریر نہیں ہے

عرب لیگ کی جانب سے جو ثقافتی وفد عربی کتابوں کے نادر مخطوطات کی تحقیقات اور ان کے فوٹو لینے کے لئے ہندوستان آیا ہوا ہے اور بڑے بڑے کتب خانوں کا دورہ کر رہا ہے، اس کے رئیس استاذ رشاد عبدالمطلب نے ۲۹ فروری کو دارالمصنفین آنے کی بھی زحمت گوارا فرمائی اور اس کے کارکنوں سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات کیا، اور دارالمصنفین کے کتب خانے اور دوسرے شعبوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، شبلی کالج کے اسٹاف کی درخواست پر انھوں نے کالج میں انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں تقریر کی، شکل و صورت اور لباس و وضع کے لحاظ سے ایک یورپین نما انسان کی زبان سے عربی میں تقریر

اعظم گڈھ کے لئے اعجوبہ چیز تھی، اس لئے سامعین نے اس کو بڑے لطف و دلچسپی کے ساتھ سنا، اتفاق سے انھی دن
علامہ شبلی مرحوم کی دو پوتیون کی شادیان اور شہر مین بعض دوسری تقریبات تھین جن مین استاد رشاد عبد المطلب بھی مدعو
تھے، ان تقریبون مین وہ خالص ہندستانی لباس مین شریک ہوئے، اور علامہ شبلی مرحوم کے اعزہ اور شہر کے عمائد و حکام
ان کی صحبت سے محظوظ ہوئے، اور ان لوگون کے لئے تو استاذ موصوف گویا نعمتِ غیر مترقبہ تھے،

وہ مصر کے نامور فضلا اور عرب لیگ کے ممتاز رکن ہین، عربی تو انکی مادری زبان ہے، انگریزی بھی بہت
روان بولتے ہین، اُن مین ذہانت و ذکاوت، علم و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کا ایسا اجتماع ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل
ہے کہ ان مین سے کس وصف کا پلہ بھاری ہے، تہذیب و شائستگی کے ایسے نمونے ہندستان مین نا پید ہین، انکی شائستگی کے
سامنے لکھنؤ کی تہذیب بھی مات ہے، اور اُس مین تکلف و تصنع کے بجائے اخلاص اور فطری بے ساختگی نمایان ہے،
اگرچہ اُن کا ظاہری لباس اور تمدن یورپی ہے، مگر اُن کی ہر ادا سے اسلامیت آشکارا تھی، اور بات بات
پر اُن کی زبان سے مذہبی فقرے اور کلمات نکلتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ
کا تمدن اگرچہ یورپی ہے مگر الحمد للہ اس کا دل مومن ہے،

چند سال ہوئے غالباً ۱۹۴۴ء مین ایران مین البیرونی کی ہزار سالہ جوبلی منائی گئی تھی، ہندستان
کی ایرانی سوسائٹی کلکتہ نے بھی اس تقریب کو منایا تھا، اور اُس کے لئے ہندستان اور بیرون ہند
کے بہت سے فضلاء نے البیرونی پر مضامین و مقالات لکھے تھے، دار المصنفین کی جانب سے مولانا عبد السلام
صاحب ندوی نے مقالہ بھیجا تھا، اب اس سوسائٹی نے ان مقالات کو کتابی صورت مین شائع کر دیا ہے،
اس مین زیادہ تر انگریزی کے مضامین اور کچھ فرنچ، اٹالین، عربی فارسی، اور اردو کے مقالات ہین،
اور وہ البیرونی کے حالات و علمی کمالات کے متعلق معلومات کا اچھا مجموعہ ہے،

مقالات

گلزارِ ابراہیم و خوانِ خلیل

از

ڈاکٹر نذیر احمد ام، اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی لٹ، لکھنؤ یونیورسٹی

سہ نثر ظہوری کو اپنے مخصوص و منفرد طرز کی وجہ سے جو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ فارسی کی صرف
چند کتابون کے حصہ مین آئی ہے، لیکن غیر معمولی شہرت کے باوجود اس کی تاریخی حیثیت بڑی حد تک مشکوک
و مجہول ہے، بعض مصنفون کا خیال ہے کہ یہ تین چھوٹے چھوٹے نثر کے رسالے ہین جن کا دیباچے وغیرہ سے کسی قسم کا
لگاؤ نہین، مثلاً خانِ آرزو مجمع النفائس مین رقمطراز ہین :-

"ملا ظہوری رسالۂ دارد در مدح بادشاہ مذکور (ابراہیم عادل شاہ) مسمیٰ بہ نورس؛

(ورق ۴۹۶ الف)

سرخوش کلمات الشعراء مین لکھتے ہین،

"در نثر رسالۂ نورس و خوانِ خلیل و گلزار ابراہیم بنام عادل شاہ بسیار خوب نوشتہ"

(صفحہ ۱۹۰)

ابراہیم زبیری بساتین السلاطین مین بیان کرتے ہین :-

"آنچہ در مدح طرازی اشہب نشان را در میدانِ فصاحت دوانیدہ از خوانِ خلیل و گلزار ابراہیم

ودیباچہ نورس ظاہر است" (ورق ۱۲۵ الف)

سعد اللہ شرح نورس مین لکھتے ہین [۱] :-

"بہ توفیق شرح نورس پیرایۂ اختتام پوشید ——— وہم بسببے برانگیز کہ شرح خوان خلیل و گلزار ابراہیم سر از دست این بے سروپا راہ خاتمہ گذارد، (نسخہ رام پور ص ۹)

اسی طرح شمس بہار عظیم مین رقمطراز ہین :-

"اگر ظہوری این بہار عظیم بنیاد الفت گلزار ابراہیم از دل برکندہ ثمر نورس را میوہ کنہ انگاشتہ دست از مائدہ خوان خلیل شستہ" (ورق ۱۴ الف)

مطبوعہ نسخہ مین دوسری اور تیسری نثرون کے عنوات یہ ہین :-

"دیباچہ دوم .... مسمی بہ گلزار ابراہیم، دیباچہ سوم ..... کہ بخوان خلیل شہرت دارد"

(ص ۲۴ و ص ۲۵)

ان کے علاوہ سہ نثر کے متعدد مخطوطات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تین نثرون کے مجموعے ہین، جن کا تعلق کسی کتاب کے دیباچے یا مقدمہ سے مطلق نہین،

کچھ لوگون کا خیال ہے کہ سہ نثر کتاب نورس مؤلفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ - ۱۰۳۷) کے تین دیباچون کا مجموعہ ہے، لیکن یہ خیال بہت بعد کی پیداوار ہے، اردو ادب کے مرتب بظاہر سب سے پہلے اس غلط فہمی کے شکار ہوئے، مثلاً ڈاکٹر زور اردو شہ پارے مین لکھتے ہین :-

---

[۱] صہبائی نے شرح سہ نثر مین متعدد جگہ ان کی نثرون کے الگ الگ نام تجویز کئے ہین، مثلاً شرح گلزار ابراہیم نیز از خامہ خام رقم صہبائی، با تمام انجامید اکنون خواہش آن ست کہ خامہ از دست افگنم، ودر گوشۂ عزلت تن زنم اما اصرار معانی طالبان آسودہ نمی گذارند کہ تا خوان خلیل گسترده نہ شود گرسنہ چشمان از شکوۂ بخل طبیعت لب نخواہند بست (ص ۲۰۷) و نیز دیکھو ص ۱۳۰ و ۲۰۹،

"سہ نثر ظہوری جو کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے اور جو ہندوستانی جامعات کے نصابون مین داخل ہے اسی اردو کارنامہ (نورس) کے دیباچہ کے طور پر لکھی گئی، (جلد ا ص ۳۵)

رام بابو سکسینہ [۲] وغیرہ بھی اسی خیال کے مؤید ہین، مگر پروفیسر عبد الغنی [۳] (مؤلف تاریخ زبان و ادب فارسی در عہد مغلیہ) ان سب سے آگے ہین، وہ بڑے اصرار سے ایک طرف تو سہ نثر کو الگ الگ تین نثری تصنیف قرار دیتے ہوئے اول کا نام نورس، دوم کا گلزار ابراہیم، اور سوم کا خوان خلیل تجویز کرتے ہین، اور دوسری طرف ان تینون کو ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس کا دیباچہ قرار دیتے ہین،

ان مصنفین کے علاوہ سہ نثر کے مخطوطات سے بھی خال خال اسی قیاس کی تائید ہوتی ہے، مثلاً نثر ثانی کی سرخی ایک نسخہ مین اس طرح پائی جاتی ہے "خطبۂ نورس مسمیٰ بہ خوان خلیل"

لیکن مولفین کا ایک تیسرا گروہ ہے، جن کا بیان (باوجود قلت تعداد کے) صحت سے بہت قریب ہے، ان کا قیاس ہے کہ سہ نثر ظہوری تین دیباچون کے مجموعے ہین، پہلی نثر کتاب نورس کا دیباچہ ہے، دوسری گلزار ابراہیم کا، اور تیسری خوان خلیل کا، کتاب نورس کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے، اور گلزار ابراہیم اور خوان خلیل ظہوری اور ملک کی دو مشترکہ تصنیف ہین، جن کی حیثیت دو بیاضون کی ہے، آزاد بلگرامی کے حسب ذیل جملہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے،

"ملک و ظہوری تالیفہا بہ مشارکت دارند، چنانچہ ظہوری در دیباچۂ خوان خلیل می طرازد ... "

(سرو آزاد ص ۲۳)

اس سے زیادہ واضح بیان ابراہیم خلیل کا ہے :-

"از جملہ منثوراتش سہ دیباچہ است کہ بر نورس و گلزار ابراہیم و خوان خلیل نوشتہ"

(صحف ابراہیم ورق ۱۰۱ ب)

---

[۱] زجہ ص ۴۲، ۵۱، [۲] جلد سوم ذیل حالات ظہوری [۳] رائل ایشیاٹک سوسائٹی مجموعہ نمبر ۳۵۹،

حقیقت یہ ہو کہ ظہوری کی یہ تینوں نثرین جو خطبہ، مقدمہ، دیباچہ رسالۂ نثر وغیرہ نامون سے یاد کی گئی ہین تین مختلف کتابون کے دیباچون کا مجموعہ ہین، جو کافی وقفہ کے بعد لکھی گئین، اس سلسلہ مین غلط فہمی پیدا ہوئی، اس کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ یہ دیباچے اصل کتاب سے الگ ہوگئے، اور اتفاق یہ ہوا کہ وہ اصل کتابین تو گمنامی مین پڑکر چشم عالم سے روپوش ہوگئین، لیکن یہ دیباچے اپنے مخصوص طرز کی بنا پر زندۂ جاوید ہوگئے، اور جون جون زمانہ گذرتا گیا، ان کے جوہر روشن ہوتے گئے، چنانچہ جب دو ایک ساتھ مدون و منطبع ہوئے، تو اُن کا مجموعی نام سہ نثر قرار پایا، اس قیاس کی تائید حسب ذیل قرائن سے بخوبی ہوجاتی ہے :-

(۱) یہ نام مطبوعہ نسخہ کے علاوہ کسی مخطوطے مین نہین پایا جاتا،

(۲) مخطوطات مین مطبوعہ نسخہ کی طرح ترتیب زمانی کا لحاظ بہت کم رکھا گیا ہو،

(۳) کثرت سے ایسے مخطوطات ہین جن مین صرف دو یا ایک ہی نثر ملتی ہے،

اس لئے اگر ان تین کتابون کی اصل حیثیت واضح کردیجائے جن پر سہ نثر کی نثرین بطور دیباچے کی تحریر ہوئی ہین تو سہ نثر کی تاریخی حیثیت پر جو پردے پڑگئے ہین، وہ خود بخود اٹھ جاتے ہین، ذیل کے اوراق مین ان کتابون کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے، چونکہ کتاب نورس کے کئی مخطوطے موجود[1] ہین، اور وقتاً فوقتاً اس پر چھوٹے بڑے مقالے لکھے جاچکے ہین، اس لئے اس کی وضاحت سے سردست قطع نظر کی جاتی ہی، البتہ چونکہ گلزار ابراہیم

---

[1] اس کے چار نسخے حیدرآباد مین ہین، جن مین دفتر دیوانی و مال کا نسخہ بظاہر خود ابراہیم عادل شاہ کے لئے نقل کیا گیا تھا، نواب یار جنگ بہادر کے مجموعہ کا نسخہ بھی نہایت عمدہ ہے، دو نسخے بمبئی مین ایک نسخہ بانکی پور مین، اور ایک رام پور مین ہے، بانکی پور کے نسخہ کے ساتھ فارسی ترجمہ شامل ہے، جس سے اُس کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے، کتاب نورس پر ایک مقالہ نصیر الدین ہاشمی نے بھی لکھا ہے، جو مقالات ہاشمی مین شامل ہے،

اور خوان خلیل کی بابت کچھ بھی معلوم نہین، اس لئے اُن کے متعلق کچھ عرض کردینا ضروری ہے،

گلزار ابراہیم نو ہزار ابیات پر مشتمل ایک بیاض تھی جس کو ملک اور ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے حکم کے بموجب مرتب کیا تھا، یہ کتاب صرف ان دونون شاعرون کی نظمون سے مرتب ہوئی، اور جس مین تقریباً تمام اصناف سخن شامل تھے، چنانچہ ملک قمی کا حسب ذیل[1] بیان اس حقیقت کا مظہر ہو،

"از پردہ نفاذ این نغمہ بدر داد داز نخل امر این مطلب بر داد وطغرائے سخن نوازی بدین نشان آراست ونشان خرد پردازی بدین رقم پیراست کہ دوران نزدیکی ونزدیکان دوری، شاہدان غیبی وغائبان حضوری، ملک و ظہوری، چہرہ پوشیدگان معنوی دروے کشودگان صوری، نوسالان چمن تازگی، ونورسان نورستان نوی، درصفت ہرچہ پیرایۂ جمال سلطنت است وآویزۂ گردن مملکت نہ ہزار بیت فلک تزین ——— از قسم مثنوی مسمی بہ منبع الانہار ونوع قصائد کہ مرسلۂ گردن زبور است وغزل کہ دام غزالان صید گیر است وترکیب بند کہ پریشانی اجزا در بسیط افگندہ وترجیع بند کہ مرجع ذوق پراگندہ است وقطعہ ورباعی چون جواہر آبدار از کنور خفا بہ سلک اظہار درآوردہ"

کتاب کا عنوان[2] ذیل کی بیت مین ہو :-

"شگفت این نظم و مرغان تہنیت خوان کہ شد گلزار ابراہیم نامش"،

مآثر رحیمی کا بیان بھی اسی امر کا مؤید ہے[3] :-

"نہ ہزار بیت در اقسام سخن بمدح ابراہیم عادل شاہ بادشاہ آنچہ گفتہ ترتیب دادہ مسمی بہ گلزار ابراہیم ساختند"

بعینہ یہی جملہ ملک کے حالات کے ذیل مین بھی پایا جاتا ہے[4]، مگر مآثر کے بانکی پور کے مخطوطے مین کچھ

---

[1] کلیات ملک ورق ۳۰ (دیباچہ گلزار ابراہیم) [2] ایضاً [3] مآثر رحیمی جلد ۳ ص ۳۹۷، [4] ایضاً، ۴۴-۱۴۸،

کچھ اضافہ ہے،[۱]

"آن دو فصاحت شعار نیز آن کتاب را بہ غایت نیکو نوشتہ اند، و ہر یک از ایشان چہار ہزار و پانصد بیت نظم و نثر گفتہ و نوشتہ، و دیباچہ بران نوشتہ اند، و یک جلد کردہ گلزار ابراہیم شدہ و این اختراع این دو بزرگوار است کہ بہ مشارکت کتاب تمام نمودہ اند"

اس مین اور ملک کے مذکورۂ بالا بیان مین تین قسم کا فرق ہے،

۱۔ ملک نے گلزارِ ابراہیم کی تدوین بحکم عادل شاہ بیان کی ہے، مگر مآثر مین اس کا ذکر نہین،

۲۔ مآثر مین دونون کا نصف نصف حصہ بتایا ہے، ملک نے اس کا ذکر نہین کیا ہے،

۳۔ مآثر مین دیباچہ کے علاوہ اس مین نثر کا کچھ اور حصہ بتایا گیا ہے، مگر ملک نے اس کا ذکر مطلقاً نہین کیا

ابراہیم خلیل[۲] نے بھی کتاب مذکور کا نام اور اس کے اشعار کی تعداد وہی بتائی ہے، جو اوپر مذکور ہے، مگر اسکندر منشی نے عالم آرائے عباسی مین اس کا نام کتاب نورس تجویز کیا ہے، اور اگرچہ اس کے بعض جزئیات مآثر وغیرہ کے مطابق ہین، مگر اس تاریخ مین ایک[۳] جگہ اس کتاب کے اشعار کی تعداد نو ہزار، اور دوسری[۴] جگہ (لفظون مین) نو سو بتائی گئی ہے، پروفیسر محمد شفیع نے عالم آرائے عباسی کے دونون صفحے نقل کئے ہین[۵] مگر انھون نے اشعار کی تعداد کے متعلق جو اختلاف ہے، اس کو نظر انداز کر دیا ہے، اسی طرح آزاد[۶] اور عشق عظیم آبادی[۷] نے تاریخ مذکور کے حوالہ سے بیاض متذکرۂ بالا کے اشعار کی تعداد نو ہزار ہی لکھی ہے، عالم آرا مین بیاض مذکور کا جو غلط نام درج کر دیا گیا ہے، اس سے پروفیسر محمد شفیع کو بہت دھوکا ہوا، چونکہ میخانہ مین منبع الانہار[۸] (تالیف ملک قمی) کا عنوان نورس نامہ لکھا ہے، اس لئے پروفیسر مذکور اس مین ۹ ہزار ابیات کے بجائے صرف ساڑھے

[۱] مآثر رحیمی قلمی ورق ۹۰ الف [۲] دیکھو صحف ابراہیم (ورق ۵۸۱) و خلاصۃ الکلام ورق ۲۲) [۳] صفحہ ۱۳۲ جلد ۱ [۴] صفحہ ۵۳ جلد ۳ [۵] میخانہ صفحہ ۲۶۶ (حاشیہ نمبر ۲) [۶] خزانہ عامرہ ص ۱۱۴ [۷] نشتر عشق صفحہ ۱۲۶۹ [۸] میخانہ ورق ۲۶۶ در ذیل حالات ظہوری لیکن ملک کے حالات کے ذیل مین اس کا عنوان درج نہین ہے، دیکھو ص ۲۵۹ - ۲۶۰،

چار ہزار اشعار کی تلاش کرتے ہین، غالباً انھون نے یہ قیاس کیا کہ منبع الانہار دراصل کتاب نورس (تحریف گلزار ابراہیم) کے نصف حصہ کے برابر ہوگی، جس کو ملک نے نظم کیا تھا، لیکن چونکہ مثنوی مذکور صرف دو ہزار ابیات پر مشتمل تھی، اس لئے وہ رقمطراز ہین[۱]،

"نورس نامہ ظاہراً ہمین مثنوی بہ نام منبع الانہار، در کتاب خانہ دیوان ہند موجود است و تعداد ابیاتش غالباً چہار ہزار و پانصد کم ست"

ظہوری کے ذیل کے جملون سے اس امر کی پوری طرح تائید ہو جاتی ہے[۲]، کہ اس نے ملک قمی کی شرکت در فاقت مین گلزار ابراہیم اور خوانِ خلیل کے نام سے دو کتابین مرتب کین، مگر اُن کی تفصیل یہان درج نہین ہے

"در نخل بیرائی و چمن آرائی گلزار ابراہیم انباز ملک الکلامی ست"

"قبل ازین در پیرایش گلزار ابراہیم و اکنون در گستردن خوان خلیل سہیم و عدیل ملک الکلامی ست"

دوسرے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ گلزار ابراہیم اور خوانِ خلیل الگ الگ موقعون پر لکھی گئین اور نیز پہلی کو دوسری پر تفوق زمانی حاصل ہے،

تعجب انگیز امر یہ ہے، کہ ظہوری کے مذکورۂ بالا جملہ نے بہت سے مستند مصنفین کو ایسی سخت غلط فہمی مین مبتلا کر دیا ہے کہ جس کی بنا پر وہ دیباچہ گلزار ابراہیم اور دیباچہ خوانِ خلیل کو بالترتیب گلزار ابراہیم اور خوانِ خلیل تجویز کرنے لگے، حال آنکہ یہ جملے بالکل نمایان طور پر بتاتے ہین، کہ دیباچے تو خود اُس کی تالیف ہین، جب کہ اصل کتابین اس کی اور ملک کی مشترکہ تصنیف ہین، اسی غلط فہمی کی بنا پر بعض مؤلفین نے ان دیباچون کے مخصوص نام فرض کر لئے ہین، جیسا کہ ابتدا مین عرض کیا جا چکا ہے، البتہ آزاد بلگرامی نے ذیل کے جملے مین دیباچون کو اصل کتابون سے ممتاز کر دیا ہے[۳]،

[۱] میخانہ ص ۲۶۸ حاشیہ نمبر ۲ [۲] کلیات ظہوری (نسخہ رامپور) ص ۸۱۴ (دیباچہ گلزار ابراہیم) ص ۸۲۷ (دیباچہ خوان خلیل) بالترتیب [۳] ید بیضا ص ۱۴۰ نیز دیکھو سرو آزاد ص ۲۳،

(ملک وظہوری) ہر دو بہ مشارکت یکدگر تخمہا در سلکِ تحریر کشیدہ اند، چنانچہ ظہوری در دیباچۂ خوانِ خلیل نوشتہ الخ،

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے بھی دیباچہ کو ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے، اور اصل کتاب کو ظہوری اور ملک دونون کی طرف، فتوحات عادل شاہی مین مفید اور تفصیلی بیان پایا جاتا ہے جس کو ذیل[1] مین درج کیا جاتا ہے:-

"(ملک وظہوری) روز و شب بصورت و معنی باہم اند، نسخہ کہ مشہور است بہ گلستانِ خلیل و باغِ ابراہیم این دو ہنر گستر عدیم المثال باہم پرداختند، نہ ہزار بیت از نظم و نثر تمام شد و آن نسخہ چون بنظر میمون کیمیا اثر مالک ممالک ہنر شناسی، ابراہیم عادل شاہ رسید، بتقریب سخن سنجان محفل بہشت طراز از محمود غزنوی و فردوسی سخن در آوردند و کوتاہی کہ در صلۂ شاہنامہ کردہ بود، سلطان بالب جاہ ابراہیم عادل شاہ اشارہ فرمودند کہ بیتے را یک ہون بدہند، نہ ہزار ہون را کہ زر لاری بود، بر شتران بار کردہ، بہ منزلِ یاران بردند، حسب الحکم گیہان خدیو ابیات را شمارہ کردند نہ ہزار، و پانصد بیت بہ شمارہ در آمد و مبلغ مذکور را دادند، بعد ازان کہ زیرکان دریافتند ظاہراً پانصد بیت را کاتب مکرر نوشتہ بود چون بعرض بادشاہ رسانیدند فرمودند سہل است باخوات امو ہون دادند"

اس مین اور دوسرے بیانات مین چند باتون مین اختلاف ہے،

۱- یہان دونون کتابون کے نام مختلف دیئے ہین، بظاہر باغِ ابراہیم، گلزار ابراہیم کی، اور گلستانِ خلیل خوانِ خلیل کی تحریف ہے،

۲- برخلاف تمام بیانون کے فتوحات مین ان دونون کے مجموعی اشعار کی تعداد نو ہزار قرار دیگئی ہے، حالانکہ صرف گلزار ابراہیم اتنے ادبیات پر مشتمل تھی،

۳- فتوحات مین نثر کو بھی ان دونون کتابون کا حصہ قرار دیا گیا ہے، مآثر کے قلمی نسخے سے پتہ

---

[1] مخطوطہ جادو ناتھ سرکار ص ۲۷۲، ۳، ۳،

چلتا ہے کہ کم از کم گلزار ابراہیم مین دیباچے کے علاوہ کچھ نثر بھی شامل تھی، مگر اس قیاس کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہین ہوتی، اغلب یہی ہے کہ گلزار ابراہیم مین حصۂ نثر محض دونون دیباچون پر مشتمل رہا ہوگا، مآثر کے فقرہ یک جا جلد کردہ سے مترشح ہوتا ہو کہ غالباً دونون نے الگ الگ ساڑھے چار ہزار اشعار لکھے، اور ان پر دو دیباچے لکھے، پھر آخر کار ایک مکمل کتاب کی شکل مین بادشاہ کی خدمت مین پیش کیا، اس قیاس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ دیوان ہند کے مخطوطے مین جو بظن غالب گلزار ابراہیم ہی ہے، ملک اور ظہوری کے حصے الگ الگ ہین، مگر یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ دونون کے دیباچے مکمل کتاب سے متعلق ہین، اپنے اپنے حصہ سے متعلق نہین،

یہان ایک دلچسپ بات کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہ ہوگا، ڈاکٹر ریو نے فتوحات کے اسی نسخے کے حوالے سے ملک اور ظہوری کی مشترکہ تصنیف کا نام گلشنِ خلیل لکھا ہے[1] جس پر دونون کو نو ہزار اشرفیان انعام مین ملی تھین، بظاہر ریو نے فتوحات کی پہلی کتاب یعنی گلستانِ خلیل کو گلشنِ خلیل لکھدیا، اور باغِ ابراہیم سہواً نظر انداز ہوگئی،

فتوحات مین محمود غزنوی، اور فردوسی کے جس قصے کی طرف اشارہ ہے اسی کے مثل ایک قصہ ملک نے منبع الانہار مین نظم کیا ہے[2]، ذیل مین اس مثنوی کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے:-

"درراست میلکے عادل خداوندا ابراہیم بے شبہہ دمانند حسن میمندی کہ در قیمت شاہنامہ طلا نقرہ ساخت و عاقبت محمودی بہ شاہ دکن کہ سیم سخن ما طلا نواخت"

بشنو چنین رفت کہ استاد طوس — داد بہ شہنامہ جمال عروس

دفتر شہنامہ چو آمد بہ بن — خاتمہ را گشت پذیر سخن

از حسن آن زشتی میمندیان — شست رگے گنج تو مندیان

گفت چنین خسرہ کہ در کار شعر — تنگدلی بردہ بہ بازار شعر

---

[1] فہرست ریو فارسی مخطوطات، ذیل دیوان ظہوری ۵۲ [2] کلیات ملک مخطوطہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی ورق ۵، ب

گوہر شصت الف بقیمت رسید	قیمت یک الف نیامد پدید
عہد بدل کردشہ غزنوی	بہ کہ مرا این کج منشی بشنوی
داشت وزیرے سر شاہ دکن	کاب گہر دادہ بہ کان عدن
گردشہ غزنوی از نقض عہد	عہد سخن گشت براہیم عہد
او بہ طلا سیم بر آمد زکاز	یکم طلا ساخت زہے شہ نواز

چونکہ نبع الانہار گلزار ابراہیم مین شامل تھی، اس لئے اس واقعہ کا تعلق نہ تو نبع الانہار پر انعام پانے سے ہے، اور نہ گلزار ابراہیم کے خاتمے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ محمود و فردوسی کے معاملے سے بہت زیادہ متاثر تھا، اور غالباً شعراء و فضلاء پر جو اُس نے غیر معمولی طور پر انعام کی بارش کی تو وہ اسی تاثر کا نتیجہ تھا،

نتائج الافکار[۱] مین گلزار ابراہیم اور خوان خلیل ظہوری کی تنہا ملک قرار دی گئی ہین، اسی طرح تاریخ اردو ادب (تالیف رام بابو سکسینہ) مین سہ نثر کے علاوہ یہ دونون کتابین ظہوری کے مصنفات[۲] مین شامل ہوتی ہین، مگر پتہ نہین چلتا کہ وہ نثر مین تھین یا نظم مین، قاموس المشاہیر مین بھی سہ نثر کے ساتھ رسالۂ نورس، گلزار ابراہیم، اور خوان خلیل ظہوری کی طرف منسوب ہین[۳]، بظاہر ان لوگون کے ماخذ کلمات الشعرا اور بساتین السلاطین وغیرہ ہین، جن مین ان تینون کتابون کو ظہوری کی تالیف قرار دیا گیا ہے، مگر ان مین یہ سہ نثر کی تینون نثرون کے الگ الگ نام تھے، اور ان تینون رسالون سے صرف سہ نثر ظہوری ہی مراد ہی، اگرچہ یہ قیاس بھی صحت سے دور ہے، مگر اس غلطی کا کیا ٹھکانا کہ ایک طرف تو سہ نثر کو ظہوری کی طرف منسوب کیا جاتا ہی، اور اس کے علاوہ تین اور رسالون کو اسی کے مصنفات مین شامل کر دیا جاتا ہی،

کتاب خانہ اودھ کے فہرست نگار، مسٹر اسپرنگر ایک دوسری غلطی کا شکار ہو جاتے ہین، انھون نے

[۱] ص ۱۱۱ [۲] ترجمہ تاریخ ادب اردو ص ۲۷۵، [۳] ج ۲ ص ۲۹،

گلزار ابراہیم کو صرف ملک قمی کی تصنیف بتایا ہے[۱]، بظاہر ان کا ماخذ ماثر رحیمی ہے، مگر ماثر مین اس طرح کا نام نہین ہے، اسپرنگر نے یہ بھی غلط طور پر لکھا ہے[۲] کہ آزاد نے گلزار ابراہیم کا نام نورس قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے بطور خود اس[۳] کا نام نورس نہین لکھا ہے، بلکہ صرف اسکندر منشی کا قول دہرایا ہے،

خوش قسمتی سے دیوان ہند کے کتاب خانہ مین نسخہ نمبر ۱۰۰۵[۴] (جس کو کلیات ظہوری قرار دیا گیا ہی) کے بارے مین جو تفصیلات ملتی ہین، وہ گلزار ابراہیم پر پوری طرح صادق آتی ہین، نسخہ مذکورہ دو حصون پر مشتمل ہی، پہلا حصہ ملک کے مصنفات سے متعلق ہے، اور دوسرا ظہوری کے، چونکہ کتاب خانہ مذکور کے فہرست نگار ڈاکٹر ایتھے نے پوری کتاب کو ظہوری کی ملک قرار دیا ہے اسلئے ملک کی نظمون کے متعلق انھون نے بڑی سخت علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے، چنانچہ ملک کے دیباچۂ گلزار ابراہیم (گو عنوان نسخۂ مذکور مین محذوف ہے) کی بابت[۵] لکھا ہے،

"یہ رسالہ ظہوری کے مشہور دیباچون کی قسم کی نثر ہے، مگر باوجود اس امر کے کہ اس مین گلزار ابراہیم کے فقرے کی بار بار تکرار پائی جاتی ہے، لیکن یہ نہ صرف ان تینون سے متفاوت ہی، بلکہ اب تک اس قسم کی جتنی نثرین ظہوری کی طرف منسوب ہین، اُن سب سے مغائرت رکھتا ہی، یہ رسالہ جو مقفی نثر پر مشتمل ہی سہ نثر ظہوری کی طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح مین ہی"

مثنوی نبع الانہار کے متعلق باوجود عنوان کی صراحت، کے حسب[۶] ذیل اطلاع بہم پہنچائی ہے،

"اگرچہ اودھ کیٹلاگ مین اس نظم کو ملک کی طرف منسوب کیا گیا ہی، مگر چونکہ خلاصۃ العلوم[۷] مین اس مثنوی کے اشعار ظہوری کے ذیل مین درج ہین، اس لئے اس کو ظہوری کی تصنیف قرار دینا چاہئے،"

[۱] فہرست کتاب خانہ اودھ ص ۱۰۸ [۲] ایضاً [۳] خزانہ عامرہ ص ۱۱۴ [۴] فہرست ایتھے جلد اص ۸۲۲،۸۲۰ [۵] ضمیمہ ۱-۸۲۰ [۶] ص ۸۲۱ [۷] تذکرۂ شعرائے مثنوی گویان از ابراہیم خلیل، اس مین صرف ۲۹ شعر مندرج ہین،

البتہ ملک کے تیسرے حصہ یعنی ترکیب بند و ترجیع بند وغیرہ کے بارے مین ڈاکٹر ایتھے خاموش ہین، مگر بہرحال ان کا قیاس ہی کہ دیباچۂ گلزار ابراہیم، منبع الانہار اور ترکیب بند وغیرہ سب کو ظہوری ہی کی طرف منسوب کرنا قرین صحت ہوگا، اگرچہ حقیقت اس کے برعکس ہی،

جس نسخہ کا نصف حصہ ملک کے کلام پر مشتمل ہو، اس کو کسی حال مین کلیاتِ ظہوری قرار نہین دیا جاسکتا، بقول ملک[۴۸]، گلزار ابراہیم دیباچہ کے علاوہ منبع الانہار، قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند، غزلیات، رُباعی وغیرہ پر مشتمل تھی، اور چونکہ نسخۂ دیوانِ ہند کے اجزا یہی ہین، اس لئے اس کو بلاشبہہ گلزار ابراہیم ہی قرار دینا چاہئے، اگرچہ ملک یا ظہوری کے بیان سے اس بات کا پتہ نہین چلتا کہ اس کتاب مین کس کا کتنا حصہ شامل ہے، لیکن مآثر رحیمی کے مخطوطے[۴۹] اور عالم آرائے عباسی[۵۰] سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہی کہ دونون کا تقریبًا نصف نصف حصہ ہی، اور دیوانِ ہند کے نسخے مین بھی ظہوری اور ملک کے کلام تقریبًا برابر ہین، اس لئے اس نسخہ کو گلزار ابراہیم تجویز کرنے مین کسی قسم کی قباحت نہین ہوتی، ذیل مین نسخۂ مذکور کے اجزا کی تفصیل درج کی جاتی ہے،

۱- دیباچۂ گلزار ابراہیم[۵۱]، اس کی ابتدا یہ ہے :-

اے نورس گلزار براہیم از تو وے آتش نمرود تف ہیم از تو

پیرایۂ دارد و زینت عدل تو نی تمکین سریر و شان دہیم از تو

ملک کا دیباچہ بھی اسی سے شروع ہوتا ہے، چنانچہ رام پور اور کلکتہ کے نسخہ مین یہی رُباعی درج ہے، ڈاکٹر ایتھے نے مزید یہ لکھا ہے کہ اس دیباچہ مین گلزار ابراہیم نام نہادم، آب بہ گلزار ابراہیم داد کہ شد گلزار ابراہیم نامش کی قسم کے فقرات مین گلزار ابراہیم کی تکرار پائی جاتی ہے، اور یہی فقرے ہندستان[۵۲] کے دونون

۴۸ دیکھو کلیات ملک ورق ۱۳۰ ۴۹ ورق ۱۹۰ ۵۰ ج ا ص ۱۳۲ و ج ۳ ص ۵۲ ۵۱ دیوان ہند کے نسخہ مین عنوان نہین ہی، مگر ہندستان کے دونون مخطوطات مین عنوان موجود ہے، ۵۲ پہلا جملہ یعنی گلزار ابراہیم نام نہادم ہندستان کے دونون نسخون مین نہین پایا جاتا،

مخطوطون مین بھی موجود ہین، خاتمہ کی بیت یہ ہی،

شگفت این نظم و مرغان تہنیت خوان کہ شد گلزار ابراہیم نامش،

اور بلاشبہہ یہی خاتمہ دیوانِ ہند کے نسخہ کا بھی ہے[۵۳]، مزید اس دیباچہ مین کئی جگہ ملک کا تخلص صراحۃً موجود ہے مگر ڈاکٹر ایتھے نے اس کے اظہار سے عمداً چشم پوشی کی ہے، مثلاً

درویشی را جائزہ شعر ملک شاہی صلۂ نغمہ بہ عادل شہ داد

یا مثلاً اس قطعہ مین ملک کا تخلص موجود ہے اور یہ نظم دیوانِ ہند کے نسخہ مین بھی پائی جاتی ہی[۵۴]:

زابراہیم عادل شاہ باقی است سخن مانند جمشید ست و جامش

ملک شد تاجدار ملک معنی فلک نوبت زنان برطرف بامش

بہ آزادی صدف بالیدہ در بحر کہ گشت از دُر بہ گوشان کلامش

ثنا آغاز فتح انجام ختم است برین است افتتاح و اختتامش

شگفت این نظم و مرغان تہنیت خوان کہ شد گلزار ابراہیم نامش

یا مثلاً پہلی بیت، درویشی را الخ ایک رباعی کا دوسرا شعر ہے، جو ملک کے کلیات کے دونون نسخون مین موجود ہے،

اسی طرح ملک اور ظہوری کے تخلص ساتھ ساتھ آئے ہین، جب ظہوری کا الگ دیباچہ اسی عنوان سے موجود ہے، تو پھر اس کو ملک کی تصنیف ماننے مین کسی قسم کا تامل نہ ہونا چاہئے،

۵۳ و ۵۴ اگرچہ ایتھے نے نہ خاتمہ کا ذکر کیا ہے اور نہ پورے قطعہ کا، مگر اس قطعہ کا آخری مصرع جس پر دیباچہ ختم ہوجاتا ہے، دیوان ہند کی فہرست مین مذکور ہے، اس سے اس نسخہ کے خاتمہ کا بھی یقین ہوگیا، اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ قطعہ اس مین موجود ہے، اور اسی قطعہ مین چونکہ تخلص بھی موجود ہی، اس لئے اس کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی علمی خیانت ہی،

غرض ان وجوہ و قرائن کی بنا پر ڈاکٹر ایتھے کی رائے کے خلاف ہم اس کو ملک ہی کا دیباچہ قرار دیتے ہیں۔[1]

۲- منبع الانہار، اگرچہ حقیقتہً دو ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ملک قمی کی تالیف ہے، جو مخزن اسرار کے مقابل لکھی گئی، لیکن دیوانِ ہند کے نسخے میں اس کو ظہوری کی طرف منسوب کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ایتھے نے اس کی ابتداء وہی بتائی ہے جو ملک کے کلیات کے تمام نسخوں میں ہے، لیکن انھوں نے محض اس بنا پر اس کو ملک کی تصنیف ماننے سے انکار کیا ہے کہ خلاصۃ الکلام میں اس مثنوی کے ۲۹ اشعار ظہوری کے ذیل میں درج کر دیئے گئے ہیں، اگرچہ خلاصۃ الکلام کے کسی شعر میں نہ ملک کا تخلص موجود ہے اور نہ ظہوری ہی کا، لیکن جتنے اشعار وہاں ہیں، وہ سب کے سب ملک ہی کی مثنوی سے ماخوذ ہیں جس میں نہ جانے کتنے بار ملک کا تخلص موجود ہے، اس لئے کسی کو اس کی نسبت میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہوسکتا، ذیل میں مثنوی مذکور سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:-

خیز و ملک را جلہ در پیش کن　　پس بہ ازین فکر دلِ خویش کن

(ورق ۶۹ ب)

بر ملک نکتہ گدا زآفرین　　بر ملک العدل ہزار آفرین

(ورق ۲ ، ۱)

خواست ملک تا در مخزن زند　　نقب شود بر دل معدن زند

(ورق ۳ ، ا)

با ملک از شعلہ بہ خسرو بہ تیغ　　دست من و آستی او در دریغ

(ورق ۳ ، ب)

---

[1] مخطوطاتِ لندن کے فہرست نگار نے اس دیباچہ کی تصریح میں جس سادہ لوحی کا مظاہرہ کیا ہے اس کا بیان نہیں ہوسکتا :- (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہست ملک قصہ، این رفتگان　　نشاء بیداری دل خفتگان

یافت بہ ہنگام عطاہائے خاص　　ام ملک نیز بہ لطف اختصاص

(ورق ۷ ، ب)

۳- ترکیب بند، ترجیع بند، قصائد بشمول قطعات و غزلیات و رباعیات :- دیوان ہند کے نسخہ میں اس حصہ کی ابتداء اس بیت سے ہوئی ہے :-

فتح است کلید بر کشادیم　　بر نہ درِ خلق در کشادیم　(صف)

ابتدائی نظم کا عنوان یہ ہے :-

"بہ فتح درِ نہ تو کلید کشائش از قلعہ کشائے نگر گرفتن و ذیل بمدح عادل خدیو بر کمر ترکیب بند کردہ از خاتمہ گرفتن" (ایضاً)

اگرچہ فہرست نگار نے اس حصہ کے مصنف کا نام نہیں لکھا ہے لیکن وہ ان تمام نظموں کو ظہوری کی ملک قرار دینے کے ذمہ دار ہیں، حالانکہ ان سب نظموں میں ملک کا صراحتہً تخلص موجود ہے، اور یہ اُس کے کلیات کے نسخہ میں بھی شامل ہیں، ابتدائی ترکیب بند، ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں ہے جو کلیات ملک کے نسخہ کلکتہ کے ورق ۱۸۵ ا تا ۱۸۷ ا تک منقول ہے، اور جو ۹ بندوں پر مشتمل ہے۔

اس حصہ کے بعد ظہوری کا کلام شروع ہو جاتا ہے، اگرچہ ڈاکٹر ایتھے نے ان دونوں حصوں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا ہے، اور وہ ایک سلسلہ میں سب کی تصریح کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ دوسرے مصنف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۸) "اگرچہ یہ رسالہ وہی ہے، جو دیوانِ ہند کے نسخہ کلیاتِ ظہوری میں شامل ہے، مگر بلا شبہہ یہ ملک ہی کی تالیف ہے، (جیسا کہ اس کے تخلص سے جو آخر کتاب میں موجود ہے، ظاہر ہے)، لیکن قوی امکان اس کا بھی ہے، کہ ملک نے اس کو ظہوری کے لئے لکھا ہو، کیونکہ وہ ملک کا عزیز تھا" (صفحہ ۱۹۶ نسخہ نمبر ۲۰۳)

[2] بسم اللہ الرحمن الرحیم اھدنا الصراط المستقیم

کے ہین، اس لئے اُن کی تفصیل الگ درج کی جاتی ہے،

۱- دیباچۂ گلزار ابراہیم، ابتدا، اس طرح ہے (صفحہ ۸۳۱)

خرمی چمن سخن بہ طراوتِ حمد بہار پیرائے ست کہ

اختتام اس بیت پر ہوا ہے :-

داستان شد ختم بستان رخش | غیرتِ گلزار ابراہیم باد

یہی ابتدا و خاتمہ سہ نثر مین دوسری نثر کا ہے، اس لئے بلاشبہہ یہ ظہوری ہی کی ملک ہے،

۲- ترکیب بند و ترجیع بند و قصائد :- ابتدا، اس بیت سے ہوئی ہے، :- (ص ۸۲۱)

اے شدہ سود از تو زیانِ ہمہ | جنس غمت زیب دکانِ ہمہ

لیکن اس حصہ کی جملہ نظمین بلاشبہہ ظہوری ہی کی ہین، اور ابتدائی ترکیب بند بارہ بندون پر مشتمل ایک نظم ہے، جو ظہوری کے کلیات (مخطوطۂ رام پور) کے صفحات ۹۷ تا ۱۰۱ منقول ہے، اور جس مین مدح ابراہیم کے ساتھ خدا کی حمد بھی شامل ہے، لیکن بوڈلین، برلن، اور رام پور کے مخطوطات کا ابتدائی قصیدہ :-

اے تشخص دہ فنا و بقا | بر بقایت فنائے جملہ گوا

اس مین شامل نہین، اسی طرح سعدی و وحشی کے مقابل کے طویل ترجیع بند بھی اس مین شامل نہین ہین،

۳- غزلیات کی ابتدا اس طرح ہے، (ص ۸۲۲)

بود اشتی نقاب ز دیدن بر آمدم | در گفتن آمدی ز شنیدن بر آمدم

مجموعۂ غزلیات کی ابتدائی غزل

آنکہ خواہد داشت فردا رتبش ایمانِ ما | گشتہ وصفش آفتاب مطلع دیوانِ ما

اس حصہ مین شامل نہین ہے،

۴- رباعیات جو بائیس حصون پر مشتمل ہین اس طرح شروع ہوتی ہین :- (ص ۸۲۲)

بر خط عارض تو تقدیم خوش است | پیش تو ز مہ سجدۂ تنظیم خوش است

اس تشریح سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جس نسخہ کو ڈاکٹر ایتھے نے کلیاتِ ظہوری قرار دیا ہے، وہ گلزار ابراہیم ہی ہے، اس سے زیادہ غلط بات اور کیا ہوگی کہ ملک اور ظہوری کے مشترکہ کلام صرف ظہوری ہی کی طرف منسوب کر دیئے جائین، مزید چونکہ یہ نسخہ اس قدر قدیم ہے کہ ۱۰۲۵ھ ہجری کی مہرین اس پر ثبت ہین، اس لئے اس کا قوی امکان ہے کہ یہ خود ظہوری کے زمانہ مین مرتب کیا گیا ہو،

خوش قسمتی سے ظہوری کے کلیات کا نسخہ (نمبر ۹۰۷) جو بانکی پور کے کتب خانہ مین محفوظ ہے، اس کا پہلا حصہ گلزار ابراہیم کے حصۂ دوم پر مشتمل ہے، اس نسخہ کی تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہوجائیگی،

۱- دیباچۂ گلزار ابراہیم ابتدا و انتہا مطابق نثر دوم از سہ نثر و نیز مطابق نسخۂ دیوان ہند (ورق ا تا ۸)

۲- ترکیب بند، ترجیع بند، قصائد، ابتدا، مطابق نسخۂ دیوانِ ہند، اس حصہ کی جملہ نظمین جو ۱۲ قصائد، پانچ ترکیب بند، اور دو ترجیع بند پر مشتمل ہین، ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح مین ہین، ہر ایک نظم باقاعدہ عنوان کے ساتھ پائی جاتی ہے، دیوانِ ہند کے نسخہ کی طرح اس حصہ مین سعدی و وحشی کے مقابل کے دونون ترجیع بند شامل نہین ہین، (ورق ۸ تا ۶۹)

۳- غزل کی ابتدا مطابق نسخۂ دیوان ہند (ورق ۶۹ تا ۸۰)

۴- رباعیات بائیس فصلون مین منقسم ہین، اور اُن کی ابتدا و انتہا نسخۂ دیوانِ ہند کے مطابق ہے، تمام رباعیان ابراہیم عادل شاہ سے متعلق ہین، اور ہر ایک کا باقاعدہ عنوان ہے، پہلا عنوان اور اس کی ۷۰ رباعیان صرف دیوانِ ہند کے نسخہ مین تو پائی جاتی ہین، لیکن نہ رام پور کے نسخہ مین ہین، اور نہ کلیاتِ ظہوری کے کسی دوسرے مخطوطے مین، اس کے علاوہ چودھوان اور انیسوان عنوان بھی رام پور کے نسخہ سے خارج ہے، (ورق ۸۰ تا ۱۲۱)

کلیات کے دوسرے چار اجزا یہ ہیں،

۵۔ قصائد و ترکیب بند (ورق ۱۲۱ - ۱۵۸) ۔۔۔ ۶۔ غزلیات، (ورق ۱۵۸ - ۲۵۴)

۷۔ دیباچۂ خوان خلیل (" ۲۵۴ - ۲۶۹) ۔۔۔ ۸۔ دیباچۂ نورس (" ۲۷۰ - ۲۷۶)

اس نسخہ کے ابتدائی چار حصوں کے اشعار کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے،

قصائد و ترکیب بند و ترجیع بند تقریباً	۲۲۲۰	ابیات
غزلیات	۳۷۰	"
رباعیات	۱۹۵۲	"
میزان	۴۵۴۲	"

چونکہ یہ گلزار ابراہیم کے تقریباً نصف کے برابر ہے، اس اعتبار سے اس کو گلزار ابراہیم کا ہی ایک حصہ قرار دینا قرین صحت ہے؛

اس حصہ کے قصائد کے مطلعے حسب ذیل ہیں،

۱۔ طریق زندہ دلان پوے درحصول حضور ۔۔۔ بہ مرگ نفس مگر ماتم تو گردد سور

۲۔ اے از وخالی دیر از ما و من ۔۔۔ از تو جان و تن و بال جان و تن

۳۔ ہمہ مخمورانت از مستی شراب آوردہ اند ۔۔۔ شعلہ از پروانہ خامان را کباب آوردہ اند

۴۔ چیست آن پیکر کہ سرتا پا زبان است و دہان ۔۔۔ در سخندانی بہ عالم طاق از جفت بیان

۵۔ اے ز روئیت درین تماشا گاہ ۔۔۔ بر مہ و آفتاب پشت نگاہ

۶۔ ز ہوز سنبل مویت نزدن جنون بہا ۔۔۔ در آرزوے تو گل داغ سینۂ گلزار

۷۔ اے بہ حسن از پری دجور فزدن ۔۔۔ عشقت آرایش درون برون

۸۔ بدنا رفتہ از خود کے درائی ۔۔۔ فروشو اے کہ می خواہی برائی

۹۔ نقد حسرت جنس بازارم ۔۔۔ کار عشقت حبذا کارم

۱۰۔ فصل ریحان و سنبل و سمن است ۔۔۔ ہر کجا بادہ و می کشی چمن است

۱۱۔ ز خامہاے دل افغان برارم ۔۔۔ اگر داغت ز مغز جان برارم

۱۲۔ دگر نوروز و ایام بہار است ۔۔۔ بہ گل خیزی زمین روی نگار است

۱۳۔ اے ز مویت صبا مسیحا دم ۔۔۔ جان بوے تو در تن عالم

۱۴۔ ہست تا رخش چرخ در دوران ۔۔۔ باد از شاہ اختیار عنان

۱۵۔ زہے بہ بخت تو نازندہ افسر و دیہیم ۔۔۔ سپہر کردہ بہ بخت تو قدر را تسلیم

۱۶۔ حبذا اے بہشت روے زمین ۔۔۔ در سجود ت سپہر سودہ جبین

۱۷۔ سخن طراز بہ مدح شہنشہ زمنم ۔۔۔ زمان دگر نتواند گشت از سخنم

۱۸۔ در خمارم شراب می خواہم ۔۔۔ در سرابم تن آب می خواہم

۱۹۔ نباشد گر امید وصل جان را دل ز تن گیرد ۔۔۔ بروز ہجر مردن داد از نیستن گیرد

۲۰۔ آگہی را حلال می خواری ۔۔۔ کہ چو شاہ ہست مست ہشیاری

۲۱۔ شاہ از بہر جسم جان آورد ۔۔۔ از سفر آمد ارمغان آورد

پانچوں ترکیب بندوں کے ابتدائی بندوں کے مطلعے حسب ذیل ہیں :-

۱۔ اے شدہ از تو زیان ہمہ ۔۔۔ جنس غمت زیب دکان ہمہ

۲۔ مژدہ اے ساکنان شہر و دیار ۔۔۔ کہ نماند از غم و الم دیار

۳۔ اے ساختہ پر نور ز رای تو سحرہا ۔۔۔ پرداختہ، نور جمال تو نظرہا

۴۔ حبذا جشن ظل سبحانی ۔۔۔ بستہ خود .... درخشانی

۵۔ جشن شاہ دکن مبارکباد ۔۔۔ بر زمین و زمن مبارکباد

دونون ترجیعات کے ابتدائی بندون کے مطلعے یہ ہین،

۱۔ فصل ریحان و یاسمین آمد   مغز ایام نافہ چین آمد

۲۔ زہے عشقت بہار زندگانی   زگلزارش گلے فصلِ جوانی

ابتدائی غزل یہ ہے :-

برداشتی نقاب زدیدن برآمدم   درگفتن آمدی زشنیدن برآمدم

بوسعت کجاست تیز ترافتادحسنِ تو   دل خیمہ شد زدست بریدن آمدم

ازتاب دردگشتہ نفس آلتِ فغان   درکنجِ غم زآہ کشیدن برآمدم

بردست آرمیدنم از دست غمزہٗ   کارم تمام شد زطپیدن برآمدم

بشاخ گوہمان گلِ بستانِ آرزو   دستم گرفت عشق زچیدن برآمدم

آن بلبلم کہ شکر نفس از دمم دمد   فرسودہ بال و پرزپریدن برآمدم

ازبیخودی بسینہ دریدن رسیدگاہ   شادم زننگ جامہ دریدن برآمدم

از جملہ بت دیدہ ظہوری چہ بدچہ نیک

تعلیم دیدنم زندیدن برآمدم

رباعیات کے عنوانات[1] حسبِ ذیل ہین،

(۱) بہائے شاہ نورس سریر رباعی نہادن (۲) نغمۂ بادشاہی

(۳) مدح طنبور (۴) توصیف نورسپور

---

[1] ان مین سے ۵ عنوانات (نمبر ۳،۵،۸،۱۱،۱۶،۲۱) کے ماتحت ملک کی بھی رباعیان ہین، ممکن ہو کہ اس کے حصۂ گلزار ابراہیم مین شامل ہون، نیز ایک اور عنوان ہو جس مین بادشاہ کی تعریف سورج اور چاند کی تشبیہ سے کی گئی ہے، اسی عنوان کے ماتحت ظہوری کی بھی ۱۰ رباعیان (مخطوطۂ رامپور مین) موجود ہین، جو گلزار ابراہیم مین شامل نہین،

(۵) تعریف عمارت   (۶) تعریف لعل

(۷) تعریف رخش   (۸) تعریف آتش بازی،

(۹) میزبانی و مہمانی   (۱۰) خط غدا یگانی،

(۱۱) وصف عقد گہر   (۱۲) طرۂ مروارید،

(۱۳) صفت زر بورس   (۱۴) توصیف باز

(۱۵) جست خیز یوز   (۱۶) توصیف طوطی،

(۱۷) تعریف انبہ   (۱۸) بالیدگی انبہ،

(۱۹) حکایات پان   (۲۰) تشبیہ پان،

(۲۱) صفت فلونیا[1]،   (۲۲) رباعیاتِ متفرقہ،

اگرچہ ابراہیم عادل شاہ سے متعلق ظہوری کے ایسے قطعات موجود ہین، جو بہ آسانی گلزار ابراہیم مین شامل ہو سکتے تھے، مگر وہ شامل نہین، اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ منبع الانہار کے مشابہ جو مثنوی ظہوری نے مخزن کے تتبع مین لکھی، وہ بھی اس مین شامل نہ ہو سکی، اس کی بظاہر وجہ یہ ہو گی، کہ گلزار ابراہیم کی تکمیل تک وہ مکمل نہ ہوئی ہو گی، کیونکہ اولاً منبع الانہار اور گلزار ابراہیم کا درمیانی وقفہ بہت کم ہے، اور ثانیاً منبع الانہار

---

[1] فلونیا ایک قسم کا معجون تھا، جو افیون وغیرہ کے اجزاء پر مشتمل تھا، جہانگیر نے جب شراب کم مقدار مین پینا شروع کی، تو اس نے یہی معجون استعمال کرنا شروع کر دیا، بعد مین افیون نے اس کی جگہ لے لی، ابراہیم عادل بھی اس کا عادی تھا، ذیل مین ملک و ظہوری کی ایک ایک رُباعی درج ہے،

شاہا نظرے کہ بیش ازین خون نخورم   بردل گرہ گوہر مکنون نخورم

شد عید و فلونیا بعیدی نہ رسید   از دست تو افیون نخورم چون نخورم

(ملک، کلیات ص ۷۱ ب)

کو ظہوری کی مثنوی پر جو بالکل ناپید ہے، تفوق[1] زمانی حاصل ہے،

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا، کہ ظہوری کی ایک مثنوی اُس کے کچھ ہی بعد مرتب ہوئی، بظاہر اس مثنوی کا کوئی عنوان نہ تھا، کیونکہ نہ اسپرنگر[2] نے اس کا کوئی عنوان دیا ہے، اور نہ دیوانِ ہند کے فہرست[3] نگار ہی نے، اور کلیات ظہوری کے رامپور کے نسخہ میں بھی اس مثنوی کا کوئی نام درج نہیں ہے، اگرچہ اس کا سنہ تالیف ۱۰۱۱ھ کے بعد ہے، لیکن دیوان ہند کے کیٹلاگ نے اس کی تاریخ ۱۰۰۸ھ محض اس بنا پر قرار دی ہے، کہ اس نظم کی آخری بیت میں تاریخ ملتی ہے،

شد بہ اتمام بس کہ زود انباز — گشت تاریخ انتہا آغاز

لیکن یہ تاریخ دراصل مثنوی کے خاتمہ کی نہیں، بلکہ شاہ نواز خان کی عمارت کی ہے، چنانچہ یہ بیت ان اشعار میں کی ہے، جو عمارتِ مذکور کی مدح میں ہیں، فرشتہ کے بھی بیان سے صاف پتہ چلتا ہے، کہ ۲۳[4] ربیع الثانی ۱۰۱۱ھ سے کچھ قبل ہی شاہ نواز خان کی بہشت نظیر عمارت تیار ہوئی تھی، اس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے، کہ اس مثنوی کا سنہ اتمام اس سنہ یعنی ۱۰۱۱ھ کے کچھ ہی مہینوں بعد ہوا ہوگا، اس اعتبار سے، اور نیز اس وجہ سے کہ یہ مخزن اسرار کے مقابلہ میں نہیں ہے، اس کا شمول گلزار ابراہیم میں نہیں ہو سکتا،

گلزار ابراہیم کا صحیح سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا، البتہ اتنا باوثوق معلوم ہے، کہ اس کی تکمیل کے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) بر سر خوان لقمہ زبائی نہ کنم — این است کہ بہ شب دست خائی نہ کنم

ترسم نہ شوم صاحب کیفیت اگر — از شاہ و گدا نیاز گدائی نہ کنم

(ظہوری، کلیات ص ۲۶۳)

[1] مینی، ص ۱۰۰، [2] ص ۱۰۰، [3] فہرست اودھ [4] ج ا ص ۲۲۲ ببعد [5] تاریخ فرشتہ ج دوم ص ۱۸۰-۸۱ لیکن یہ عمارت نورس پور میں نہ تھی، بلکہ بیجاپور میں تھی، اس لئے اس کو نورس محل وغیرہ سے الگ سمجھنا چاہئے، البتہ اس عمارت کا ایک حصہ نورس بہشت کے نام سے موسوم تھا، (ص ۱۸۱ سطر ۱۵، ۱۳)

وقت ابراہیم عادل شاہ، اپنی عمر کے تیسرے[1] عشرہ میں تھا یعنی اس کی عمر تیس سال سے کم تھی، چونکہ اس کا سنہ ولادت ۹۷۹ھ ہجری ہے، اس اعتبار سے ۱۰۰۹ھ میں اس کی عمر تیس سال پوری ہو جاتی ہے، گویا اس طور سے اس کتاب کی تکمیل کا سنہ ۱۰۰۹ھ کے قبل طے ہی ہے، اس میں چونکہ نورس پور اور نورس محل وغیرہ کا ذکر ہے، اور ہم عصر مورخین کے بیان کی رو سے[2] ۱۰۰۸ھ میں ان دونوں کی بنیاد ڈالی گئی، بس گلزار ابراہیم کی تاریخ تصنیف ۱۰۰۸ھ اور ۱۰۰۹ھ کے درمیان کی کوئی تاریخ طے پاتی ہے،

اس کتاب کی تکمیل پر ملک اور ظہوری کو گران قدر صلے ملے تھے، ماثر رحیمی کی صراحت[3] کے بموجب بادشاہ نے اس کے مصنفین کو نوے ہزار لاری سکے جو چالیس ہزار روپیوں کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیئے تھے یہی رقم معزز قبا دلہ کے صحف ابراہیم و خلاصۃ الکلام میں درج[4] ہے، مگر فتوحات میں[5] ہے، کہ ہر بیت پر ایک اشرفی انعام میں ملی اور کل نو ہزار دی گئیں لیکن جب ابیات غور سے گنی گئیں نو ساڑھے نو ہزار ٹھہریں، چنانچہ پانچ سو بقیہ اشرفیاں بھی برآمد ہوئیں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ پانچسو بیت کی تکرار ہے لیکن بادشاہ نے اسکی واپسی کا مطالبہ نہ کیا، فتوحات میں بھی زرلاری کا ذکر بھی پایا جاتا ہے، بظاہر انعام کا تعین اشرفیوں میں ہوا ہوگا لیکن ادائگی زرلاری میں ہوئی ہوگی، چونکہ یہ سکہ قیمت میں کمتر اور وزن میں زیادہ تھا اس لئے اتنی رقم کے بھیجنے کے لئے کئی اونٹ درکار ہوئے[6]

"بیتے را یک جون بد ہند، نہ ہزار جون راکہ زلاری بود، بر شتران بار کردہ بہ منزل یاران بردند"

عالم آرائے عباسی میں دو اضافے ہیں[7]، ایک تو یہ کہ گلزار ابراہیم میں ملک اور ظہوری کا حصہ (تقریباً) برابر تھا جس کی ایک طرح سے تائید ماثر رحیمی کے نسخے سے ہوتی ہے، اور دوسری بات یہ کہ دونوں کو انعام بھی برابر ملے[8]، مگر اس کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہیں ہوتی،

---

[1] دیباچہ گلزار ابراہیم ص ۸۱۲-۸۱۳ (کلیات) [2] دیکھو تذکرۃ الملوک ص ۲۴۸، و فتوحات عادل شاہی، ص ۱۵۰

[3] ورق ۱۰۵ و مطبوعہ ص ۲۹۷، و ۲۶۸ ببعد [4] ورق ۱۸۰ و ۱۲۲ بالترتیب [5] ص ۳۶۲ [6] دیکھو ج ا ص ۱۳۲

درج ۲ ص ۵۲، [7] ص ۱۳۲، پر انعام کی برابری کا ذکر ہے، مگر ص ۵۲، پر کل تعداد صرف نو سو ہے، ہر ایک کے ساڑھے

لیکن خود ملک قمی کی صراحت کے بموجب انعام سونے کے سکّے میں دیا گیا، جو اتنا گران تھا کہ چار اونٹ پر لاد کر ظہوری اور ملک کے یہاں بھجوایا گیا، [۵۱]

"چون گلزار ابراہیم بہ پیش قبول رسید، چہار شتر زر در حجرۂ ظہوری و ملک زانو زدند"،

بظاہر انعام کی کثیر رقم اور اس کا اونٹ پر لادنا وغیرہ افسانہ نما معلوم ہوتا ہے، مگر اس کو جب تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، تو تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ اوپر جو کچھ لکھا گیا، اس میں صداقت کا عنصر بہت غالب ہی، ممکن ہے کہ اس کی تفصیل میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، مگر دوسرے اور واقعات کے لانے سے اس کی صداقت بڑی حد تک آئینہ ہو جاتی ہے، یہ بات تقریباً محقق ہو چکی ہے، کہ منبع الانہار کی تکمیل پر ملک کو ایک اونٹ سونا انعام میں ملا، تاریخی حوالہ جات کو نظر انداز کر کے صرف ایک واقعہ کی طرف [۵۲] اشارہ کیا جاتا ہے،

"ابراہیم عادل شاہ نے جب ملک کی مثنوی منبع الانہار دیکھی تو اس قدر متاثر ہوا تو اپنے تمام درباری شعراء کو حکم دیا کہ وہ مخزنِ اسرار کا جواب لکھیں، سب لوگوں نے شاہی حکم کی تعمیل کی مگر حیدر ذہنی نے جو شوخی کلام، بذلہ گوئی اور لطیفہ سنجی میں ید طولی رکھتا تھا جب ذیل رباعی نظم کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور اپنی معذوری کا اظہار کیا :-

در مدح و ثنایت اے شہنشاہ دکن	معذورم دار اگر نہ گفتم مخزن
حیف است کہ بہر یک شتر زر گیرم	خون دو ہزار بیت بدہ بر گردن

مورخین کا خیال ہے کہ اس رباعی پر حیدر ذہنی کو بھی اتنا ہی انعام مرحمت ہوا [۵۳]، اسی حیدر کی بذلہ سنجی پر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۷) چار سو شعر کا ذکر ہے، البتہ انعام کی تعداد نو ہزار روپیہ طلائی ہے، جو نو ہزار طومان عراقی کے برابر ہوتی ہے، برخلاف پہلے بیان کے جس میں نہ ہزار ہون کی بالمناصفہ تقسیم کا ذکر پایا جاتا ہے،

۵۱ کلیات ملک دیباچہ خوان خلیل (ص۱۱) ۵۲ مثلاً دیکھو عرفات ورق ۱۲۳۹ میخانہ ص۶۶۱، و عرفات ورق ۱۸ الف و باغ معانی ورق ۱۰۳ الف و مخزن الغرائب ص ۲۶۵ وغیرہ ۵۳ مثلاً دیکھو میخانہ ص۲۶۱،

ایک مرتبہ بادشاہ اس قدر خوش [۵۴] ہوا کہ

"بزبانِ الہام بیان خسرو عالم گذشت کہ موافق حروف بحساب ابجد ہر کرا مولانا حیدر دشنام بدہد آن قدر ہون بیابد، مولانا اول از بادشاہ گرفتہ صد و یک ظرافت ہزار ہون یافتند و مثل این ہر کدام فراخور عدد حساب می دانند مبلغ چہار ہزار ہون آن روز بملا حیدر رسید"،

ملک نے منبع الانہار میں یہی داستان نظم کی ہے [۵۵]، جو ذیل کی بیت پر ختم ہوئی ہے،

شاہ کہ دشنام برغبت خرد	نقد دعا را بہ چہ قیمت خرد

ظہوری نے حیدر کے اسی واقعہ کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے [۵۶] :-

"کالائے دشنامش را بہ نرخ دعا می خرند و زرہائے سرہ خرج می کنند تا سرہ بزنند"

فتوحات میں بھی ہے [۵۷] :-

"در شیرین گوئی و نغز گفتاری دشنام از و می توان بزر خرید"!

سخاوت و دریا دلی و علم پروری کے ایسے کارنامے تاریخ عالم مشکل سے پیش کر سکے گی، مگر ہندوستان میں اس طرح کے متعدد و واقعات بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کارنامے ملیں گے، جن کے دیکھنے کے بعد بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے، کہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را	گاہ گاہے باز خوان این قصہ پارینہ را

خوانِ خلیل، ملک اور ظہوری نے گلزار ابراہیم کی طرح ایک اور بیاض تیار کی، جس کا عنوان خوانِ خلیل تھا، مگر بدقسمتی سے ہمارے پاس جو کچھ مواد ہے، اُس کے پیش نظر ہم اس پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، البتہ اُس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مورخین و تذکرہ نویسوں میں صرف آزاد بلگرامی صراحتہً اس کے وجود کی اطلاع دیتے ہیں، گو اُس کی حیثیت کے تصور سے وہ بھی قاصر تھے

۵۴ فتوحات عادل شاہی ص۳۲۵ ۵۵ کلیات ملک سوسائٹی مخطوطہ ورق ۱۳ الف ۵۶ دیباچہ خوان خلیل کلیات ظہوری مخطوطہ ص ۲۰۲، ۵۷ ص ۲۰۲

لیکن اُن کے بیان سے زیادہ واضح بیان خود ظہوری کا ہے، اور جیسا کہ گلزار ابراہیم کے ضمن میں اشارہ کیا جا چکا ہے، ظہوری کے قول سے صاف ظاہر ہے کہ گلزار ابراہیم مرتب کرنے کے کچھ عرصہ بعد خوان خلیل کی تکمیل ہوئی، مگر سب سے زیادہ مفید اور واضح بیان ملک کا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے[۵۱]:-

"گلزار ابراہیم بہ بخشش قبول رسید، جماز شتر زر بر در حجرۂ ملک ظہوری زانو زدند مار بر دوبے درنگی، ساز ایثار بدرنگ آوردیم[۵۲]

کرد خورشید زر بدست نثار بہ سر شاہد سخن ایثار

شکر این عطیہ بر ذمہ لازم شمردیم، دکان دو دریا را (کو دک وار گوشان گرفتہ) بہ شاگردی دل دوست استاد نورس آوردیم کہ بہ تعلیم زر فشانی (دگو ہر پاشی ذائقہ) آیند، اکنون بآرایش خوان خلیل، مائدہ سخن در آئین بندیت و بہار خاطر در شگفتگی چمن بے بساط (الوان) خوش آیند نیست، گلزار ابراہیم را از خوان خلیل گریز نیست،"

اس سے حسب ذیل حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

(۱) خوان خلیل گلزار ابراہیم کا تکملہ ہے (۲) خوان خلیل گلزار ابراہیم کے بعد لکھی گئی،

(۳) گلزار ابراہیم کی طرح یہ بھی دونوں کی مشترکہ تالیف تھی، اس کا عنوان بلاشبہ خوان خلیل ہی ہے،

ظہوری کے دیباچہ خوان خلیل کے آخری بیت میں یہ عنوان اس طرح آیا ہے،

"در این بستان سرا خوان خلیل آید بیاد میزبان خلق ابراہیم عادل شاہ باد

دیباچہ مذکور کی ابتدا ایک رُباعی سے ہوتی ہے، جس کی دوسری بیت یہ ہے،

نطق از تو بہ مہمانی ارباب خرد[۵۳] انداختہ خوان از سخن خوان خلیل

[۵۱] نمیات ملک (رام پور نسخہ) دیباچہ خوان خلیل ص۱۱[۵۲] [۵۳] ملک نے بھی بعینہ یہی خیال ذیل کے ابیات میں ظاہر کیا ہے،

ضیافت خانہ ترتیب دادم بو نورس ہاے ایوان زیب دادم

شدم زینت الوان دلیش ضیافت کردم از خوان خلیلش

دوسرے مصرعہ کا ایک اور نسخہ ہے،

"انداختہ خوان سخن از خوان خلیل"

مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ میں اُس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے،

"نطق بہ استعانت تو برائے ضیافت ارباب خرد خوان سخن ازین خطبہ کہ موسوم بہ خوان خلیل است، گسترده"[۵۴]

مولانا صہبائی اگرچہ اس دیباچہ ہی کو خوان خلیل تصور کرتے ہیں، مگر اس تشریح کو غلط قرار دیتے ہیں[۵۵] بہر حال اتنا تو مسلّم ہی ہے کہ مولانا صہبائی اور حواشی نگار کا یہ قیاس کہ اس دیباچہ کا عنوان خوان خلیل ہے، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، اگرچہ ظہوری کی متذکرۂ بالا بیت سے اس کا قطعی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، لیکن جب اس کو دوسرے اور واقعات سے ملایا جاتا ہے، تو صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دیباچہ خوان خلیل اور خوان خلیل الگ الگ دو چیزیں ہیں، دیباچہ خوان خلیل، ملک اور ظہوری نے الگ الگ لکھے، اور خوان خلیل دونوں کے کلام کے چند مخصوص حصہ کا مجموعہ تھا، اور دونوں کے دیباچے نثر میں ہیں، گو نظم کا حصہ کا بھی کافی ہے، لیکن خوان خلیل نظم کی ایک بیاض ہے،

خوان خلیل اصناف سخن میں حسب ذیل پر مشتمل تھی،

"قصائد، غزلیات، قطعات، مثنوی، رباعیات"

ملک کے مندرجہ ذیل[۵۶] بیان سے اسکی صراحت ہوتی ہے،

[۵۴] یعنے از خوان خلیل ہمین رسالہ ..... مراد دارند یعنی نطق من از سخن رسالہ خوان خلیل برائے مہمانی اہل سخن خوان گسترده تا ایشان فائدہ بردارند، اما از خوان خلیل این رسالہ را ارادہ کردن رکاکتے دارد کہ جز اہل مذاق بآن پے نبرد۔" اس کے خیال سے نظر کرنا چاہیے کہ صہبائی اس رسالہ کا نام خوان خلیل نہیں قرار دیتے، ان کا اعتراض تنقیدی اور علمی و تاریخی نہیں، (دیکھو شرح سہ نثر صفحہ ۲۰۹،

[۵۶] دیباچہ خوان خلیل (ملک) صفحہ ۱۳،

"گوش و زبان، ز گفت و شنید، محو چشم و چراغ در رنگ و بو خفتہ، ذائقہ بے چاشنی و کلام از لذت خالی ماندہ، سالار خلت پسندیدہ (چند) رنگ نعمت منزل بعد و تنزلات حضرات خمس قصیدہ و غزل و قطعہ و مثنوی و رباعی، اگر در دیباچہ بکار ی بکار زرفت خاطر از نقوش وہمی سادگی اختیار کرد"

آخری جملے سے مزید ثابت ہو کہ خوان خلیل اور دیباچہ خوان خلیل دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن خوان خلیل کی ضخامت مجموعی اشعار، انعام وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی اطلاع نہیں، البتہ جس بادشاہ نے دشنام کو حروف ابجد کے حساب سے خریدا ہو، ایک رباعی پر ایک اونٹ اشرفیاں عنایت کی ہوں گلزار ابراہیم پر چار اونٹ سونا انعام بخشا ہو، اس نے خوان خلیل کی تکمیل پر کیا کچھ نہ دیا ہوگا،

ظہوری نے دیباچۂ خوان خلیل لکھتے وقت اپنی عمر ستر سال بتائی ہے[1] ظہوری کا سنہ پیدائش معلوم نہیں، صرف میخانہ میں اس کی عمر وفات کے وقت ۸۰ سال بتائی ہے، اور چونکہ سنہ وفات بالاتفاق ۱۰۲۵ھ ہو، اس لئے اس کا سنہ پیدائش ۹۴۵ھ ہجری قرار پاتا ہے، اور دیباچۂ مذکور کا سنہ تکمیل ۱۰۱۵ھ ہجری ثابت ہوتا ہے،

جس طرح گلزار ابراہیم کا دونوں نے دیباچہ لکھا تھا، اسی طرح انھوں نے خوان خلیل کا بھی دیباچہ الگ الگ لکھا، خوش قسمتی سے دونوں دیباچے ہنوز محفوظ ہیں، سہ نثر ظہوری میں تیسری نثر دیباچۂ خوان خلیل ہی ہے، اور کلیات ملک[2] کے رام پور کے نسخے کے یہ دیباچہ محفوظ ہے، اور بظاہر ملک کے دیباچہ کا یہ تنہا نسخہ ہے، جس کے ابتدائی چند صفحے اس قدر کرم خوردہ ہیں کہ باوجود انتہائی کوشش کے پوری طرح پڑھے نہیں جا سکے،

امید کہ اوپر کی تشریح سے سہ نثر کی تاریخی حیثیت صحیح طور پر روشن ہو سکے گی،

---

[1] کلیات ظہوری دیباچہ خوان خلیل، ص ۲۰۷، [2] ایضاً ص ۲۶۹،

"یہ زبان کے دعویدار!"

از نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی

دسمبر ۱۹۵۱ء کے "معارف" میں جناب شوکت سبزواری ایم اے لکچرار شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کا مقالہ "لکھنؤ کی زبان" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، چونکہ بحث کا تعلق زبان سے ہے، نفس مضمون کا جائزہ لینے سے پہلے پروفیسر صاحب کی انشا پردازی کے بعض نمونوں کی طرف توجہ دلاؤں گا، اُن کے مضمون کا افتتاحی جملہ ہے: "لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم تو ادب میں ہے یہ زبان کے ساتھ طرز بیان کو بھی شامل ہے" خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے، اگر یہی دلی کی ٹکسالی زبان ہے، تو پھر کوئی اسلوب نگارش مطرود نہیں ہو سکتا، سیدھی بات تھی: "لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم ادبی ہے جس میں طرز بیان بھی شامل ہے"، ایک اور جملہ: "رئیسانہ ٹھاٹ باٹ ہے یہ عامیانہ زبان ہے"، ہم ٹھاٹ کے ساتھ باٹ کا پُچھلا نہیں لگاتے، مگر بقول ایک دوسرے دہلوی پروفیسر کے دلی والوں نے زبان سیکھی ہی عوام سے ہے، پھر فرماتے ہیں "لکھنؤ کی زبان دلی اور دوسرے مقامات کی زبان سے جہاں اردو بولی جاتی ہو مختلف نہیں، اور جو تھوڑا بہت اختلاف ان دو زبانوں میں ہو"... "لکھنؤ کی زبان دلی اور دوسرے مقامات کی زبان سے مختلف بھی نہیں، تاہم دو زبانیں ہیں، ان دو زبانوں میں کا قول ہے مگر معانی بجنسہٖ تو عبارت درست ہو جاتی ہے، اور جو تھوڑا بہت اختلاف ہو،....."

پروفیسر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے، کہ معمولی مقامی اختلافات کی وجہ سے زبان کی نوعیت نہیں بدلتی، لیکن کیا فصیح و غیر فصیح کا امتیاز بھی مٹ جاتا ہو؟ کیا ہر شہر و قریہ کی زبان معیاری سمجھی جا سکتی ہے؟ پروفیسر صاحب "اس پڑوس" لکھتے ہیں، ہم "اڑدس پڑدس" بولتے ہیں، کیا دونوں فقرے ایک ہی درجہ میں فصیح ہیں،

اُن کی یہ عبارت لیجئے: "ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا، دلی والون نے آنکھون سے لگایا، اور دل مین بٹھایا" "دل مین بٹھانا ذہن نشین کرنا ہے نہ کہ ذہن نشین ہونا، "دل مین جگہ دی" کہنا چاہئے تھا ولی نے دہلوی شاعری کی کایا پلٹ دی، مگر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں، کہ ولی کی اصلاحی تحریک لسانی اعتبار سے کوئی بڑی تحریک نہین، "متعدد تذکرہ نویسون کا خیال ہے کہ اردو شاعری کا آغاز ہی دکھنی اردو مین ہوا، وہان سو سوا سو برس پھلنے پھولنے کے بعد ولی کے ذریعہ سے دلی پہنچی"، اور اسکی دیکھا دیکھی، دلی والون مین صحیح مذاق سخن سنجی پیدا ہوا، خود پروفیسر صاحب کو اعتراف ہے کہ "دکن سے شاعری کا غلغلہ بلند ہوا، نئی زبان نئی لے، نئے خیالات، نئے انداز، یہ طرز سب کو بھایا" یہ بھی ارشاد ہو چکا ہے کہ "ولی کا کلام دلی والون نے آنکھون سے لگایا، اور دل مین بٹھایا" غالب کا قول نقل کرتے ہین کہ تم نے ولی کے دیوان کا حال سُنا ہوگا، کہ دلی مین آیا تو جیسے کسی چیز پر لوگ گر پڑتے ہین، اسی طرح اُس کے کلام پر گر پڑے" تاہم یہ فیصلہ کرتے ہین، کہ اردو جب شعر و شاعری کے روپ مین دلی پہنچی تو دلی کے محاورے کے مطابق نہ تھی، دکن و گجرات کی زبانون نے اس کو مسخ کر دیا تھا، مصلحین زبان نے ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کو اپنے محاورے کے مطابق کیا" یہ بالکل جدید انکشاف ہے کہ ولی کا کلام دلی کے مصلحین زبان کی اصلاح سے مزین ہے، اگر یہ حقیقت ہے تو دکن سے کس شاعری کا غلغلہ بلند ہوا تھا؟ اور کس چیز پر بقول غالب لوگ گر پڑے یا ٹوٹ پڑے تھے،

اس تعلق کے بعد کہ ناسخ نے اردو زبان کو دوسری زبانون کے اثرات سے جو اسکے مزاج اور سرشت کے موافق نہ تھے پاک کیا، اور ناسخ زبان کی شریعت کے مجدد ہین، اُن کی لسانی تجدید نے اردو زبان کا نکھار کر نیا رنگ روپ دیا، اور نئی زندگی بخشی" مرثیانہ انداز مین فرماتے ہیں، کہ "باوجودیکہ لکھنو اردو کا وطن یا مولد و منشا نہین، لکھنو کی زبان مین ایک بانکپن اور رئیسانہ تکلف ہے، اور لکھنو کی تہذیب اور اُس کی آن بان کی آئینہ دار ہے" تاہم بیشتر انصاف پسندی کے بعد اسی زبان کی تحقیر پر اُتر آتے ہین، اور یون زہر اُگلتے ہین،

"ہرچند لکھنو کی زبان امیرزادون کی گود مین پلی، اور محلون مین پروان چڑھی، لیکن لکھنو اور اُس کے آس پاس کا علاقہ اودھی اور اودھ کے حلقہ کی دوسری بولیون کا علاقہ ہے، یہان کے عوام کی زبان اور بولی ٹھولی اردو نہ تھی، یہ پوربی بولتے تھے، گھرون اور گلیارون مین اسی کا سکہ چلتا تھا، دربار مین اردو بولنے والون کے گھربار کی زبان پوربیا تھی، جس طرح دکن مین اُردو مقامی بولیون سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی، لکھنو مین بھی اُس نے اودھی کی بہت سی خصوصیات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کر لیا،....."

کس قدر مضحک ہے یہ ادعا کہ وہی لوگ جو دربار مین فصیح اردو بولتے تھے گھر پہنچتے پہنچتے گنوار ہو جاتے تھے، اگر دربار والون کی گھریلو زبان پوربیا تھی، تو وہ کون امیرزادے تھے جن کی گود مین اردو پلی اور وہ کون محل تھے جن مین پروان چڑھی، دہلی کے خاندان امنڈ کر لکھنو مین آ بسے تھے، ان کا وطن تو لکھنو ہو گیا، مگر جس زبان کو وہ ہمراہ لائے تھے، وہ اجنبی ہی رہی، اور لکھنو اُس کا وطن نہ ہو سکا لکھنو مین اردو پلی، اور پروان چڑھی، مگر لکھنو اس کا منشا یعنی جائے نشو و نما نہ ہوا تھا نہ ہوا، یہ عجیب نکتہ ہے لکھنو والون کی زبان پر تو نہین، مگر پروفیسر صاحب کی زبان پر اودھی نے ضرور قبضہ جما لیا ہے گلیارے دیہات سے مخصوص ہین، شہر مین گلی کوچے ہوتے ہین، انھون نے شہر کے گھرون سے گلیارون کو بھی گروا دیا، مین پروفیسر صاحب سے استدعا کرون گا، کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی تحریر مین لکھنو کی جگہ دلی، اور اودھی کی جگہ پنجابی پڑھین، نیز ناسخ کے متعلق اپنا یہ قول ذہن مین رکھتے ہوئے کہ زبان کے اس پیغمبر نے صحیح اور باقاعدہ استعمال کا ایک معیار قائم کیا، دہلی کے تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر کا یہ مطلع پڑھین

هم نے ہے اُس کی ادائے ناز پہچانی ہوئی چال پہچانی ہوئی، آواز پہچانی ہوئی،

اور دیکھین کہ دہلی کی اُردو پر اُس کی پڑوسن پنجابی کے کتنے رنگ جمے ہوئے ہین،

پروفیسر صاحب لکھنو کی گھریلو زبان کو اودھی سے متاثر کہتے ہین، حالانکہ زبان کی ترتیب ناسخ نے

اپنی محلون مین ہوتی تھی، بیگمات کی زبان مستند اور ٹکسالی مانی جاتی تھی، یہین نفیس اور دل پذیر اختراعات ہوا کرتے تھے، اپنے ایک سابقہ مضمون کا اقتباس پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون :-

"یہ بھی ممکن غالب ہے کہ اگر یہ لوگ دہلی نہ چھوڑتے، تو وہان بھی وہ فروعی تغیرات رونما ہوتے جو امتدادِ زمانہ سے اور بدلے ہوے ماحول مین لکھنؤ مین صورت پذیر ہوے، کیونکہ علم اللسان کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ہر تیس سال کے بعد زبان مین کچھ ردوبدل ضرور ہو جاتی ہے، اس کی ایک دلچسپ مثال ذہن مین آئی، عربی کا لفظ مُندرِس (بر وزن منعکس) جس کے معنی ہین بار بار دُہرایا ہوا، کہنہ، فرسودہ، زدہ، مٹا ہوا، اردو مین آکر مندرس (نون غنہ بروزن خرس) ہوگیا، اور اُس کا اطلاق صرف اس اترن یا اتری ہوئی پوشاک پر ہونے لگا، جو غریبون اور ناداروں کو تقسیم کردی جائے، یہ بھی اگلے زمانہ کی بات ہوگئی، اب خود لکھنؤ مین بہت کم لوگ واقف ہین کہ مندرس کسے کہتے ہین، اور ایک زمانہ تھا، جب یہ جملہ عام تھا، "جاڑے آرہے ہین مندرس بانٹ دو" لفظ ایسا انتخاب کیا گیا، جو غیر معروف تھا تاکہ غربا کی خودی مجروح نہ ہو، اُترن کہنے مین یہ پہلو نکلتا تھا، یہ بھی یاد رہے کہ اُس دور مین کپڑے بسیرین ہو کے نہین اُترتے تھے، بات مین بات نکل آئی، یہان بھی لغت کی زبان کے محاورے مین فرق ہے، صاحبِ نور اللغات لکھتے ہین،

"بسیرا (ت) مذکر، دھجی، چیتھڑا، لیر، بسیری، مونث، چھوٹی دھجی (فقرہ) ماں باپ نے بسیریان لگا دین، لیکن ان معصومون کو اچھا ہی پہنایا"

ہم جمع کی حالت مین بسیرین کہتے ہین، نہ کہ بسیریان، یعنی 'بسیرا' کا الف خارج کرکے 'بسیر' بنایا، نیز اُس کی تصغیر یا بقول صاحب نور اللغات تانیث 'بسیری' کو بھی ترک کردیا، چیتھڑون مین چھوٹے بڑے کی تفریق کچھ بھی نہین، اب 'بسیر' دھجی یا چیتھڑا ہے، اور اُس کی جمع بسیرین ہے،

نہ کہ بسیریان" (از چھان بین صفحات ۱۲۳، ۱۲۵)

یہ مضمون کتنے ہی برس اُدھر رسالہ نگار لکھنؤ مین چھپا تھا، اور اب میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے چھان بین مین شامل ہے،

ایک مثال اور یاد آئی، دہلی مین نگموترا بمعنی غمزۂ بے جا ہے، (سودا کے کلام مین موجود ہے) لکھنؤ کے محلات مین بھی نگموڑا جس کے ادا کرنے مین زبان اینٹھتی برتی ہے، نگمورا ہوگیا، ذرا سی تبدیلی نے ایک ثقیل لفظ کو کتنا سبک اور لطیف بنا دیا، اسی طرح ان محلات مین اشغلا اشتغلا ہوگیا، ایسی اصلاحات متعدد ہین، پروفیسر صاحب ان آبگینون کے مقابل اودھی کا چرخا ندھتے ہین، !

کس قدر افسوسناک ہے یہ امر کہ ہمارے لسانی اجتہادات کو سراہنے کے بدلے ہمین، اودھی کا دست نگر ہونے سے متہم کیا جائے، ہم تو لکھنؤ اور دہلی کی زبان مین تفریق کرنا روا سمجھیں، اور ہمارے متعلق کہا جائے، کہ لکھنؤ، اردو کا وطن نہین، نہ وہ اس کا مولد ہی ہے، نہ منشا، خیر صاحب آپ اپنے دل کو یونہی خوش کر لیجئے،

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے اُن رُجحانات کی طرف توجہ دلائی ہے، جن کی بنا پر وہ لکھنؤ کی زبان کو اودھی سے متاثر سمجھتے ہین، فرماتے ہین کہ

"سب سے زیادہ عام اور نمایان رجحان لکھنؤ کی زبان کا یہ ہے، کہ اس مین اسما، اور الفاظ کی تذکیر و تانیث کا کوئی معیار نہین، بہت سے الفاظ جو دہلی مین مذکر ہین، لکھنؤ والے اُن کو مونث بولتے ہین، اُس کے برعکس مونث کو مذکر، اُس کی ایک بھونڈی صورت یہ ہے کہ عربی مونث الفاظ کی جمع کو بھی وہ مذکر بتاتے ہین، اردو مین ان مونث اسماء کی جن کا آخری حرف صحیح (؟) ہے، فاعلی حالت مین جمع "ین" بڑھا کر بنائی جاتی ہے، جیسے عورتین آئین، راتین گذرین، لکھنؤ والے یہ قاعدہ مذکر اسماء مین بھی جاری رکھتے ہین، اور لفظ کی جمع لفظین، برس کی برسین، جیت کی جیتین، اور شہر کی شہرین

بناتے ہین، یون تو دلی مین بھی تذکیر و تانیث کا کوئی ٹکا بندھا، (بندھا ٹکا کہئے اگر) اصول
نہ پہلے تھا، اور نہ اب ہے، لیکن اردو وہان کی پیداوار ہے، وہین کے آب و گل سے اُس کا
خمیر تیار ہوا، وہان کے باشندے ہی اُس کے مزاج شناس ہو سکتے ہین، وہ اس کی فطرت کو
جانتے ہین، اس کی افتاد طبع پہچانتے ہین، وہ اپنے ذوق سے یہ فیصلہ کرتے ہین، کون سا لفظ
اردو مین مونث ہے، اور کونسا مذکر، ایک مزاج دان طبیب ہی بتا سکتا ہے کہ کون سا ان
مریض کے انگ لگے گا، اور کون سا نہین"

اور ترقی کرتے اور فرماتے ہین کہ

"لکھنؤ والے ویسے بھی لفظون کی تذکیر و تانیث کا مذاق نہین رکھتے، وہ اس کا صحیح
احساس کر ہی نہین سکتے" کیونکہ لکھنؤ اودھی علاقے مین ہے، اور اودھی زبان تذکیر و تانیث کے
معاملہ مین کسی قدر نرم ہے"

اصل اعتراض سے بحث کرنے سے قبل اتنا عرض کر دون کہ پروفیسر صاحب اردو کو اودھی سے متاثر
کرتے ہین جس مین اسماء کی تذکیر و تانیث کا کوئی معیار نہین، مگر اس طرف مطلق توجہ نہین کرتے، اور اس کا
سبب دریافت نہین کرتے، کہ یہی اودھی زدہ اردو والے الفاظ و اسماء کی تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنے
مین اتنی منہمک کیون ہے، اگر پروفیسر صاحب کا ادعا درست ہوتا، تو لکھنوی اردو تذکیر و تانیث کے قواعد
وضع کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرتی، پروفیسر صاحب دلی کے مذاق تذکیر و تانیث شناسی کے بڑے مداح
ہین، حالانکہ سیکڑون الفاظ ہین جن کی تذکیر و تانیث مین خود دلی والون مین اختلاف ہے، صرف ایک
مثال، ہم لفظ سانس کو بلا اختلاف مونث استعمال کرتے ہین، دہلی مین اختلاف ہے، ذوق کہتے ہین،

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے مین ہو گی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

شاہ ظفر:-

ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی ۔۔۔ دل مین ہے آگ مرے اور لگاتی جاتی

داغ مذکر نظم کرتے ہین:-

دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے ۔۔۔ ورنہ بیمار غم عشق مین کیا رکھا ہے

ان مین سے ایک نہ ایک کا مذاق تذکیر و تانیث شناسی ضرور بگڑا ہوا ہے،

یہی لکھنؤ والے جو تذکیر و تانیث کے تعین مین بزعم پروفیسر صاحب بھٹک جاتے ہین، اُس کے متعلق
کتابین تصنیف کرتے ہین، اصول مقرر کرتے ہین، جلال مرحوم نے مفید الشعراء لکھی، ناسخ نے بقول ڈاکٹر ابو اللیث
صدیقی بڑی کاوش سے تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کئے، (ملاحظہ ہو لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۰)، ہم
الٹے سیدھے قواعد مرتب تو کرتے ہین، آپ اپنی کہئے کہ آپ نے کیا کیا؟ کس برتے پر تتا پانی؟

اب دیکھئے کہ پروفیسر صاحب آنکھون مین کس طرح دھول جھونکتے ہین، اُن کی عبارت ہے کہ

"اردو مغربی ہندی کے حلقہ اثر کی زبان ہے، تذکیر و تانیث کا فرق اُس کی گھٹی مین پڑا
ہوا ہے، لکھنؤ اس حلقے سے باہر ہے وہان کے رہنے والے تذکیر و تانیث کا شعور اگر رکھتے بھی ہین تو
وہ اُس درجہ کا نہین، جو دلی والون کا ہے"،

پروفیسر صاحب کس قدر دلیری سے کام لے رہے ہین، گویا وہ اُردو جو لکھنؤ مین بولی جاتی ہے، اُس کا
مآخذ وہی مغربی ہندی نہین ہے، جو دلی کا ہے، اگر ہے تو لکھنؤ والون کی گھٹی مین بھی تذکیر و تانیث کا شعور
اُسی طرح پڑا ہے، جس طرح دلی والون کی گھٹی مین، اور اگر مین کہون کہ مغربی ہندی کی بولیون مین بندیلی
برج بھاشا، قنوجی بھی شامل ہین، اور یہ سب دہلوی اُردو کی گھٹی مین پڑی ہوئی ہین، جس سے یہ بھانت بھانت
کی بولیان بولنے لگی ہے، تو پروفیسر صاحب کو بغلین جھانکنے کے واسطے کچھ نہ بن پڑے اور اگر مین یہ اضافہ کرون
کہ اس مغربی ہندی مین پنجابی بھی سمو گئی ہے، تو پروفیسر صاحب پر راہ فرار بھی مسدود ہو جائے،

اب پروفیسر صاحب کے اس اعتراض کو لیجئے، کہ ہم عربی مؤنث الفاظ کو جمع کی صورت میں مذکر کہتے ہیں،

یہ آپ میرے ہوش کی بات ہے خود مولوی عبدالحق صاحب نے (قواعد اردو ص ۳۹) تحریر کیا ہے کہ بعض متاخرین اہل لکھنو کا یہ قول ہے کہ اصول صحیح ہو یا غلط، اس کو اردو پر اودھی کے اثر سے کیونکر تعبیر کیا جاسکتا ہے، جب یہ کل کی بات ہے، میں خود اُن لوگوں میں ہوں جو اس قاعدے کی سختی سے پابندی نہیں کرتے، اور اپنے ایک مضمون مشمولہ رسالہ شاعر بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اس امر کا اعلان بھی کرچکا ہوں،

اعتراض کا دوسرا حصہ سراسر بہتان ہے میں نے کسی ثقہ کو برہمیں، جتیں، اور شیریں بصیغہ جمع بولتے نہیں سُنا، اور پروفیسر صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا، لفظ کی جمع بشیک الفاظ کے علاوہ نقطیں مستعمل ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے، ناسخ نے مذکر نظم کیا ہے،

ہے طلب سے اس قدر نفرت کہ رہتا ہے خیال آ نہ جائے نقط لب پر باب استفعال کا

رشک نے مؤنث نظم کیا ہے:-

ع شام نقطیں ہیں سفیدی ہے سحر کاغذ کی

اس کے بعد اودھی تاثر کے ماتحت پروفیسر صاحب نے "نے" کی معرکہ آرا بحث شروع کی ہے، اور اس تمہید کے ساتھ اودھی میں سرے سے "نے" کا وجود ہی نہیں، اس لئے کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں، اگر لکھنو والوں سے اس کے ترک و اختیار میں لغزش ہوجائے، پروفیسر صاحب نے حال ہی میں لکھنو کے بعض اہل قلم کے یہاں دیکھا، کہ وہ فعل بولنا کی ماضی کے ساتھ جب وہ متعدی بھی ہے، اور اس کا مفعول بھی مذکور ہے، "نے" نہیں لاتے، مثلاً وہ یوں لکھتے ہیں:-

"مرد جھوٹ بولا، عورت جھوٹ بولی، وہ دو جملے بولا وغیرہ، دہلی اور اُس کے نواح میں اُس نے جھوٹ بولا، اور اُس نے دو جملے بولے" یوں کہتے ہیں،

پروفیسر صاحب نے غور نہیں فرمایا، کہ فرق دراصل "وہ" اور "اس" کے استعمال کا ہے "وہ" کے ساتھ

"نے" آہی نہیں سکتا، اور وہ پر نہ تو اُن کا اعتراض ہے، نہ ہو ہی سکتا ہے، اسی طرح واحد اور جمع کا فرق ہے، "وہ دو جملے بولا اور چپ ہوگیا" اُس نے دو جملے بولے اور چپ ہوگیا، مجھے اس جملے کے "اُس نے" سے بھی پنجابیت جھانکتی معلوم ہوتی ہے، یہ نہ بھی ہو تو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب جن کی کتاب قواعد اردو سے پروفیسر صاحب کے نحوی اعتراضات مستعار ہیں، (اودھی کا شگوفہ محض پردہ داری کے لئے چھوڑا گیا ہے) تسلیم کرتے ہیں کہ "وہ جھوٹ بولا" بھی صحیح ہے، (قواعد اردو طبع ثانی ص ۱۵۴)

پھر لکھنو کی اردو کو اودھی کا پروردہ ثابت کرنے کو فرماتے ہیں، کہ "ہم" تاکید اور حصر کے لئے ہی بطور لاحقہ استعمال ہوتا ہے، جیسے وہی اور انھی وغیرہ...... ان پر بھی لکھنو والوں نے اودھی کے زیر اثر جمع کی صورت میں ہی کو ہیں بنادیا، وہ انھی کو انھیں اور ہم ہی یا دکو (؟ اثر) ہمیں کہتے ہیں"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دہلوی اردو پر مغرب سے تو پنجابی نے یورش کی، اور مشرق سے اودھی نے دھاوا بولا، ادھر پنجابی "نے" کا گلا حلق سے اُتارنے پر اڑی ہوئی تھی، ادھر اودھی "ہیں" کے ٹھوکے دے رہی تھی، غریب کی جان سولی پر تھی، مجبوراً دونوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی، "نے" کی مثال دی جاچکی، اب "ہیں" کی باری ہے تو سنئے،

میر دہلوی:-

تھا تو وہ رشک حور بہشتی ہمیں میں میر سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

غالب دہلوی:-

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

میر مہدی مجروح دہلوی

اس کا ملنا تو ہے بہت دشوار گم ہوں اس راہ میں ہمیں نہ کہیں

اودھیت کا آخری اُلٹا: علامت مصدری "نا" کو فاعل کا تابع ہونا چاہئے، مذکر ہے، تو "نا" مؤنث ہو

ونی، لکھنو والے دونون صورتون مین نالاتے ہین، مصدر مین تذکیر و تانیث کے قائل نہین، یہ بھی جلال لکھنوی، اور اُن کے بعض معاصرین کی اُپج ہے، پروفیسر صاحب کی طرح یہ غریب سنسکرت کے عالم نہ تھے، اُن کے متعلق ایسا حسن ظن کہ سنسکرت کا گُر نہ سمجھ کر دھوکا کھایا، پروفیسر صاحب کی نوازش ہے، اہل بس، ناسخ کے وقت سے لے کر آج تک جلال کے بیان کردہ قاعدے کی کسی نے بلا استثنا، پابندی نہین کی، گو بہت سے اُن کے بھی ہمنوا ہوگئے، ناسخ کہتے ہین،

اگر دہلیز چھونے کی تجھے تعزیر دینی ہے
ہمارے ہاتھ بندھوا اپنے دروازے کے بازو سے

مین نے اپنے کانون سے دورانِ گفتگو مین اکثر ثقات لکھنو کو علامتِ مصدری بدل کر بولتے سُنا ہے، خود جلال کے ہم عصر امیر مینائی اگر ایک طرف کہتے ہین کہ

باغبان کلیان ہون ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہین ایک کمسن کے لئے

تو دوسری طرف کہتے ہین،

بڑھا اس قدر ہجر مین دردِ دل — مجھے سانس لینی بھی مشکل ہوئی
یا
جھاڑنی ہے کون سو گل کی نظر — بلبلین پھرتی ہین کیون تنکے لئے

اس مین شک و شبہہ کی گنجایش نہین کہ اردو کی تربیت و پرداخت دہلی مین ہوئی، مگر دلبری کی ادائین لکھنو نے سکھائین، الھڑ پن نہین دور ہوا، یہ ناطورہ ناظرین دہلی اور لکھنو دونون کی جانِ روح ہے، جو اس کا منکر ہے، وہ ہٹ دھرم ہے، دہلی کی ہو، یا لکھنوی یا اور کسی خطۂ گمنام کا، مین نے جو کچھ لکھا، لکھنو پر بے جا حملون کی مدافعت مین لکھا، دہلی کی تنقیص مد نظر نہ تھی، اگر یہ پہلو بھی نکلتا ہو تو اُس کے ذمہ دار حضرت شوکت سبزواری ہین، دلی کے نادان دوست،

روحانی دنیا

از

جناب عبدالماجد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز بہار پٹنہ

اللہ تعالیٰ نے دنیا مین کیا کیا پیدا کیا ہے، اس کی حقیقت اور منشاے تخلیق جاننا انسان کے بس سے باہر ہے ذہن انسانی کا یہی کمال ہے کہ ان محسوس یا غیر محسوس اشیا کی جن کے وجود کا علم ہو جائے تحقیق کی کوشش کرے لیکن یہ ضروری نہین کہ وہ کامیاب بھی ہو جائے، علم کے ذرائع حواس خمسہ ہین، اُن کی جولان گاہ محسوسات اور معلومات تک محدود ہے، جو چیزین ان حدود سے باہر ہین، ان کا علم اور اُن کی حقیقت جاننا ہمارے بس مین نہین، معلومات کے کچھ ذرائع علوم ماوراے طبیعیات سے تعلق رکھتے ہین لیکن ہمارا ان پر حاوی ہونا آسان نہین، کچھ لوگ ایسے گذرے ہین کہ جنھون نے عالم بالا کے علوم ہم تک پہنچائے ہین، مگر اُن کی بتائی ہوئی حقیقتون کو مان لینا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے، کیونکہ فطرۃً ہم اپنے دلائل عقلی کے تابع ہین جن مسائل کو دلائل سے جانچنے اور پرکھنے مین ہم قاصر ہین، اُن کے ماننے مین ہمین دشواریان پیدا ہوتی ہین

اگرچہ عالم بالا کی خبرین پہنچانے والے انبیاء اور اولیاء ہر ملک اور ہر عہد مین ظاہر ہوتے رہے ہین لیکن ہمیشہ ایک چھوٹی ہی جماعت ان کی تعلیمات سے فیضیاب ہوئی، اور عموماً بڑی جماعت عقل اور استدلال کے پیچھے سرگردان رہی، اس مین شک نہین کہ مادیت کے انکشافات اسی جماعت کی بدولت ہوتے رہے، اس لئے ہم اس کے احسانات سے اس وقت تک سبکدوش نہین ہو سکتے، جب تک اس دنیا مین ہم کو رہنا ہے انہی ماہرین مادیت کو ہم سائنس دان کہتے ہین، اور علوم طبعیات کو سائنس، سائنس بھی قدرت کی پیدا کی ہوئی

چیزوں کی حقیقت ماہیت اور حکمت جان لینے کو کہتے ہیں،

اگرچہ سائنس کی موجودہ دنیا آنیوالی زندگی اور روحانی دنیا کے خلاف زبردست عقیدہ رکھتی ہے، مگر یہ پرزور الفاظ میں کہا جاسکتا ہے، کہ سائنس دانوں کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے، روح اور روحانی دنیا کا عدم ثابت کرسکیں، کیونکہ یہ دنیا تجربات انسانی سے ماورا ہے، اور جس چیز کا انسان کو تجربہ نہ ہو، اس پر سائنس کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوسکتی، یہ دوسری بات ہے کہ ایک انسان اپنا ایک اصول بنالے کہ جس چیز کا اس کو علم نہ ہو، اس سے انکار کردے، اور اب تک اسی طرح روحانی دنیا کا انکار ہوتا رہا، لیکن یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اب مردہ میں جان پھونکنے کی کوشش میں تو سرگردان رہیں، مگر اس امر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جان یا روح ہے یا کیا چیز،

دنیا ایسے لوگوں کے وجود سے کبھی خالی نہیں رہی ہے، جو کسی نہ کسی عنوان سے روح اور روحانی زندگی کا ذکر کرتے رہے، ایسی حالت میں یہ ہماری کوتاہ نظری ہوگی کہ ہم ایک ایسے مسئلہ سے بے اعتنائی، اور غفلت برتیں جو ہماری زندگی کے لئے مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم ہے، اولاً وہ ہمارے وجود کا ایک اہم جز ہے، دوسرے یہ کہ ہمارے اعمال کا دارومدار اسی عقیدے پر ہے اس لئے اگر اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے، تو ہمارے اصول زندگی کچھ اور ہونے چاہئیں، آج ہم اپنا اقتصادی نظام محض انہی موجودہ ضرورتوں کے پورا کرنے کے اصول پر بناتے ہیں، لیکن آیندہ زندگی کا تخیل صحیح مان لینے کے بعد ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا، کہ زندگی کی ضروریات اس طرح نہ پوری کیجائیں جس سے آنیوالی زندگی میں کسی طرح کا نقصان ہے،

تمام مذاہب نے روح اور روحانی دنیا یا ایک آنے والی زندگی کے مسئلہ پر زور دیا ہے، اور تمام اعمال کا دارومدار اسی عقیدہ پر رکھا ہے، چنانچہ دین موسوی، دین عیسوی اور دین محمدی نے یعنی سارے ادیان ابراہیمی نے اسی کی تبلیغ کی ہے، اور اعمال کے حسن وقبح کا معیار یہ قرار دیا ہے، کہ وہ عمل جس سے

آیندہ زندگی میں فلاح وسعادت حاصل ہو، وہ خیر ہے، اور جس سے عذاب اور شقاوت میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو وہ شر ہے، تمام مذاہب نے یہ تعلیم دی ہے کہ آیندہ زندگی میں نیک اعمال کا انعام ملے گا، اور برے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی، ہندو دھرم نے بھی آنے والی زندگی پر بہت زور دیا ہے، اور اس کا سارا اصول عمل اس پر قائم کیا، کہ جسم فنا ہوگا، اور روح باقی رہے گی، اور انسان کو اپنی کرنی کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا،

اب زمانہ سائنس کا ہے، مذہب کے بتائے ہوئے مسئلے بے چون وچرا نہیں مانے جاسکتے، اور نہ کسی انسان کو بغیر تجربہ کے کسی چیز کے ماننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کے ثبوت میں دلائل بھی ہیں، اور واقعات وتجربات بھی اس کی تائید کرتے ہیں جن کو میں آگے پیش کرونگا، یہ مسلم ہے کہ جب ہم کسی چیز کی تحقیق کرنے لگتے ہیں، تو پہلے اس کی جانچ پڑتال کے آلات بھی مہیا کرتے ہیں، اور جو آلات موجود نہیں ہوتے، ان کے بنانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً حرارت جانچنے کے لئے تھرمامیٹر (Ther-mameter) ہوا کی رفتار کا قیاس کرنے کے لئے بیرومیٹر (Barometer) اور حرکت دور کا حساب لگانے کو اسپیڈومیٹر (Speedometer) مگر ان تمام آلات کا دائرہ عمل مخصوص ہے، تھرمامیٹر سے ہوا کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اسپیڈومیٹر سے حرارت کا پتہ چلانا محال ہے اسی طرح ایک شے کی جانچ کرنے والے آلے سے دوسری چیز کی جانچ نہیں ہوسکتی لیکن عالم روحانیت میں ہمارا عمل اس کے برعکس ہے، ہم مادی اشیاء کا علم حاصل کرنے والے حواس سے عالم روحانی کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اگر اس سے پتہ نہیں چلتا تو اس کے وجود ہی کا انکار کردیتے ہیں، اور اس کے ماننے والے کو دیوانہ سمجھتے ہیں، جو سراسر زیادتی ہے، روح کا علم روحانی علوم کی مشق ہی سے حاصل ہوسکتا ہے، اور ماورائے طبیعیات کا علم انہی آلات کے ذریعہ ہوسکتا ہے، جن کا تعلق ان علوم ماورائے الطبیعیات سے ہے، مگر یہ چیزیں عقل انسانی میں نہیں آسکتیں، جس طرح ایتھر کے ارتعاش کا اثر گراموفون پر نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ریڈیو اپریٹس کی ضرورت ہے اسی طرح روحانیت کے علم کے لئے طاقت روحانی درکار ہے،

جو لوگ روحانیت کی مشق بہم پہنچا کر، ماورائے طبیعیات کے امور کا ادراک کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں، وہ خود مادیت سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں، اس لئے ہم اُن سے پوری طرح استفادہ نہیں کرسکتے، اور عام انسان اس عالم کے علم اور اس سے تعلقات پیدا کرنے کے وسائل سے قاصر رہتے ہیں چنانچہ اب تک یہ علوم خانقاہوں اور عبادت گاہوں تک محدود تھے، مگر اب خدا کا شکر ہے، کہ جس طرح مادیات کے علوم اور ان کی تحقیق و تفتیش کا ذوق عام ہوگیا ہے، اسی طرح علوم روحانی کے اصول کا شوق بھی بڑھ رہا ہے، اور معبدوں اور عبادت گاہوں سے باہر بھی پبلک لائبریری، ریسرچ سوسائٹی، کالج ہال وغیرہ میں یہ انکشافات دکھائے جارہے ہیں، اور آفتاب باطن کی ضوافشانی ہورہی ہے،

قبل اس کے کہ روحانی دنیا کے متعلق بحث شروع کی جائے، یہ معلوم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کیا سائنس یا مادیت اور روحانیت میں کسی طرح مطابقت و مفاہمت ہوسکتی ہے؟ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں، اس لئے علمائے طبیعیات کے تمام مباحث کا دارومدار اسباب و علل اور تجربات پر ہے، برخلاف اس کے عالم روحانیت محض معتقدات اور مسلمات پر مبنی ہے، اس کو اسباب علل اور تجربات سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً جب ایک عالم طبعیات بارش پر بحث کرتا ہے، تو اس کا انحصار بخارات ارضی پر رکھتا ہے، لیکن اصحاب روحانیت یا اہل باطن اس کی نسبت ایک ایسی ذات اور اس کی مشیت کی طرف کرتے ہیں، جس کو نہ کسی نے دیکھا ہے، اور نہ دیکھنے کا امکان ہے، اور نہ اُس کی مشیت کا علم انسان کو ہونا ممکن ہے، ایسی حالت میں دونوں میں مطابقت کیسے ہوسکتی ہے، لیکن درحقیقت دونوں چیزیں ایک ہی ہیں، البتہ دونوں کے تجربے اور تحقیق کے طریقے جداگانہ ہیں، ایک طبقہ بخارات ارضی کے صعود کرنے اور بدلی چھا جانے سے یہ قیاس کرتا ہے، کہ بارش کا یہی ذریعہ ہے، دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ سیکڑوں دفعہ گھنگھور گھٹا چھا جاتی ہے، اور بغیر برسے یونہی نکل جاتی ہے، یہاں تک کہ پورا موسم برسات گذر جاتا ہے، اور پانی نہیں برستا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدلی، ہوا اور پانی سب کسی ایسی بڑی طاقت

کے ماتحت ہیں، جو ہمارے ادراک سے بالاتر ہے، جب اور جہاں پر اس کا حکم ہوتا ہے، پانی برس جاتا ہے ورنہ بدلیاں آتی جاتی رہتی ہیں، اور ہمیں ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح جیسے ڈاکیہ بار بار ہمارے سامنے سے گذر جاتا ہے، لیکن نہ کوئی خط آتا ہے، نہ منی آڈر، مگر جب ہمارے نام کی کوئی ڈاک ہوتی ہے تو پکار کر اور بند کیواڑے کھلوا کر دے جاتا ہے، اس لئے ہمیں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، اُس کے بعد جو چیزیں نگاہ سے اوجھل ہیں، وہ بھی نمایاں اور روشن ہوجائیں گی،

سائنس اور مذہب کے فرق کو بتانے یا دونوں کو ایک ثابت کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا ہے کہ ہمارا تخیل سائنس کے متعلق صحیح نہیں ہے، سائنس نام ہے، خدائے تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے راز سمجھ لینے کا سوا اس کے سائنس کوئی چیز نہیں، کوئی شخص بتا نہیں سکتا، کہ مقناطیس کو لوہے کے گرد چکر دینے سے برقی شرارے کیوں پیدا ہوتے ہیں، سوا اس کے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ ایسا ہی ہوتا ہے یہی تجربہ ہے فطرت نے اس کو یہی خاصیت عطا کی ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ فطرت نے یہ طاقت اسی کو کیوں عطا کی ہے، کسی اور چیز کو کیوں نہیں عطا کی، اگر شورے کو گندھک کے گرد یا مَسل کو تانبے کے گرد گھمایا جائے، تو اُن سے شرارے پیدا نہیں ہوتے، حالانکہ اُن میں آگ پہنچانے اور آگ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے، ہماری تحقیق اسی حد تک ہے، کہ کسی ایک چیز کو دوسری خاص چیز کے ساتھ ملانے یا ٹکرانے یا گھمانے سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ہم ایک چیز کی خاصیت دوسرے میں نہیں پیدا کرسکتے، ہمارا کمال یہ ہے کہ ایک چیز کو کی وہ خاصیت دریافت کرلیں، جو فطرت سے اُسے عطا ہوئی ہے، ہم اُس میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرسکتے اور ہماری تحقیقات کا دارومدار تمام تر ہمارے تجربوں پر ہے، اسی طرح جن لوگوں نے باطنیات کا علم حاصل کیا ہے، ان کا تجربہ یہ ہے کہ جو مشیت خدا کی ہوتی ہے، وہی ہوتا ہے، وہ چاہے تو لکڑی میں سانپ کے خصوصیات پیدا کردے، پانی پتھر بن کر کھڑا ہوجائے، پتھر پانی بن کر بہنے لگے، مردہ ایک پھونک میں زندہ ہوجائے، اور زندہ انسان مجسم زمین میں دھنس جائے، یہ لوگ خدا اور خدا کے سارے صفات کو اسی طرح

جانتے اور مانتے ہیں، جیسے ماہرین طبعیات کسی طبعی اصول کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ کیونکہ ایک سائنس دان کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا، کہ اگر دہکتی ہوئی آگ کے بڑے ڈھیر میں کسی انسان کو ڈال دیا جائے، تو وہ صحیح و سالم رہ سکتا ہو لیکن ایک مومن کو اس کا یقین واثق ہو کہ ابراہیم خلیل اللہ نمرود کی دہکائی ہوئی آگ میں جل نہ سکے اور پوری طرح صحیح سالم ہشاش و بشاش اور اللہ تعالیٰ کے فضل کا کرشمہ دیکھ کر نہایت مشکور و مسرور رہے، افسوس ہے کہ عوام کے لئے آسان نہیں کہ وہ بھی ان اصولوں اور ان عقائد کو سمجھیں اور اس پر یقین کریں جن کو ارباب حقیقت دیکھتے اور سمجھتے ہیں،

اصحاب علم و نظر پہلے ہر چیز کا سبب دریافت کرتے ہیں، پھر ہر سبب کا مسبب تلاش کرتے ہیں مگر پھر ایک حد پر پہنچ کر تحیر پیدا ہو جاتا ہے عقل مجبور ہو جاتی ہے اور کہہ دینا پڑتا ہے، کہ بس یہ اسی طرح ہے اور اسی طرح ہوتا ہے، سائنس کی انتہا فطرت پر ہوتی ہے، ارباب باطن نے ابھی ایک حد قائم کی ہے، کیونکہ تمام کائنات کے لئے ایک مسبب ضروری ہے، اور کسی شے کے وجود کو بغیر سبب کے عقل قبول نہیں کر سکتی اس لئے ایک نہ ایک آخری سبب یا مسبب الاسباب ماننا ضروری ہے، خواہ فطرت کو مانا جائے، یا خدا کو ایک طبقہ کے نزدیک فطرت نے ساری کائنات پیدا کی ہے، اور دوسرا طبقہ خدا کو خالق مانتا ہے، فطرت کو ماننے والے اتنی بڑی کائنات کے وجود میں آنے اور ان سے اتنے نتائج ظہور پذیر ہونے کو ایک ایسی طاقت پر محمول کرتے ہیں، جس کی طاقت شعوری نہیں، اور ہم ایسی ذات کو مسبب الاسباب مانتے ہیں، جس میں شعور، عقل، حکمت، علم، پیش بینی، ساری چیزیں انتہائی کمال کے ساتھ موجود ہیں، ہماری دلیل یہ ہے کہ اس قدر مسلسل ذرائع اور اسباب کا پیدا کرنا غیر شعوری طور پر کیونکر ممکن ہے اور ایک عقل انسانی کیونکر اس سے مطمئن ہو سکتی ہے،

تمازت آفتاب سے بخارات پیدا ہوتے ہیں، بخارات سے بدلی، بدلی سے بارش، بارش سے قوت نمو، قوت نمو سے انواع و اقسام کے نباتات، نباتات سے حیوانات کی پرورش، اس سے انسانی دماغ

کا وجود اور اس کی پرورش، پھر انسانی دماغ سے طرح طرح کے تخیلات و ادراکات ان سے قوت ایجاد اور قوت ایجاد سے مختلف قسم کی مشینیں طرح طرح کی دوائیں، انسانی ضروریات کی طرح طرح کی چیزیں وغیرہ وجود میں آتی ہیں، اتنے لمبے سلسلہ کی تخلیق اور اس کے اسباب و علل کو ایک ایسی طاقت سے منسوب کرنا جو شعوری صلاحیت سے بالکل عاری ہو، میرے خیال میں عقل انسانی کا انتہائی بودہ پن اور محرومی و ناکامی ہے

اس کے برخلاف ارباب مذہب مسبب الاسباب کو صاحب شعور مانتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اس نے یہ ساری کائنات انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کی ہے، اس لئے ہماری دعا یا استدعا پر وہ اپنی مشیت بدل سکتا ہے، قلب ماہیت کر سکتا ہے، بہتے دریا سے خشک راستہ نکال سکتا ہے، ایک انسان کو آسمان پر کھینچ سکتا ہے، اس قسم کے اور تمام تصرفات کر سکتا ہے، پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون فریق حق پر ہے، اور کون غلطی پر، لیکن اسی کے ساتھ محض کسی ایک فریق کے معتقدات اور تجربات کو بغیر کسی دلیل کے ناقابل اعتنا سمجھنا غلط ہے، کسی انسان کا یہ دعویٰ کہ اس نے ہر شے کی حقیقت سمجھ لی ہے، بڑا غلط ہے، نئے نئے تجربات سے کتنے مسلمہ اصول، اور کتنی تھیوریاں بدلتی، اور کتنی نئی نئی چیزیں وجود میں آتی رہتی ہیں جن کا انسان کو وہم بھی پہلے نہیں ہوتا، اس لئے بہت ممکن ہے کہ آئندہ چل کر موجودہ تھیوریاں غلط ثابت ہو جائیں، اور مذہب و روحانیت کو ہر پڑھا لکھا انسان اسی طرح ماننے لگے، جس طرح ایتھر اور اس کے اثرات کو آج مانتا ہے، حالانکہ یہ چیز بھی ہمارے لئے ویسی ہی ناقابل احساس ہے، جیسے روح جس طرح ہم ریڈیو پر ڈرامے اور چرچل کی تقریریں سن کر یقین کرتے ہیں کہ ایتھر تمام کائنات میں پھیلا ہوا ہے، اور اس میں ارتعاش پیدا کرنے سے آوازیں منتقل ہوتی ہیں، اسی طرح اگر دو ہزار برس قبل کے کسی شخص کی روح کو بلا کر اس سے وہ واقعات سنا دیئے جائیں جو امریکہ اور جاپان میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں، تو پھر روح اور روحانیت سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے اس مسئلہ میں بھی توجہ اور تحقیق سے کام کرنے کی ضرورت ہے

یہ روز مرہ کا تجربہ و مشاہدہ ہے، کہ ہمارے جسم اور ہمارے اعضاء کسی ایک بڑی طاقت کے تابع ہیں،

جب تک اس سے تعلق قائم ہے، اس وقت تک وہ کام کے ہین، ورنہ بیکار، عام اصطلاح مین اس کا نام زندگی
زندگی کہتے ہین، اور ہم اسی کو روح کہتے ہین، فرق یہ ہے کہ ہم روح کو جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی زندہ
اور موجود سمجھتے ہین، دوسرے لوگ جسم کی طرح اس کو بھی معدوم و نابود تصور کرتے ہین، اور یہ معلوم ہو چکا ہے
کہ تمام مذاہب نے یہ سمجھایا ہے کہ روح مین مرنے کے بعد بھی طاقت احساس موجود رہتی ہے، ہندو مذہب
کے رو سے تو روح جسم کے فنا ہوتے ہی دوسرا جسم اختیار کر لیتی ہے، لیکن سلسلۂ ابراہیمی کے مذاہب مین
روح عالمِ ارواح مین پہنچتی ہے، اور رنج و راحت محسوس کرتی ہے:

روح اس وقت تک جسم سے تعلق رکھتی ہے، جب تک جسم کے اعضاے رئیسہ کام کرتے رہتے ہین یعنی
جب تک معدہ بدل مایتحلل پہنچاتا، جگر اپنا کام کرتا اور قلب خون پھیلاتا رہتا ہے، اس وقت تک روح
جسم سے تعلق رکھتی ہے، اور جونہی اعضاے رئیسہ اپنا کام انجام دینے کے لائق نہین رہتے، روح ان کو
ترک کر دیتی ہے، اور اسی ترک کو موت کہتے ہین، یہ موت جسم کی موت ہوتی ہے، روح کی نہین،
اس مین شک نہین کہ روح کے متعلق انسان کو بہت کم معلومات ہین، اور اس سے زیادہ ہو بھی
نہین سکتے، کیونکہ ہمارے حواس خمسہ اس کے ادراک سے قاصر ہین، اہلِ عرب بھی ایک زمانہ دراز تک
روح کے متعلق محض اٹکل سے رائے زنی کرتے رہے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، اس لئے جب سرورِ کائنات
صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے، اور لوگون کو اس بات کا اندازہ ہو گیا، کہ آپ ماوراے طبعیات کی بہت
سی باتین جانتے ہین، اور مخالفین نے آپ کی نبوت کے امتحان کے لئے آپ سے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے
آپ جو کچھ کہتے تھے، خدا کی وحی کے مطابق کہتے تھے، چنانچہ خداے تعالےٰ نے فرمایا ہے، وَمَا یَنْطِقُ
عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، چنانچہ اس سوال کے جواب مین یہ وحی نازل ہوئی،

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ
یعنی تم سے روح کے بارے مین پوچھا جاتا ہے، کہدو کہ روح خدا کے حکم سے ہے،

مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا،
اور تمہین (انسان کو) بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے،

جو لوگ خالق عالم کا وجود ہی ماننے کو تیار نہ تھے، وہ ایک اور غیر مرئی چیز یعنی روح کے ماننے کو کب تیار
ہوتے، جس سے اور زیادہ الجھاؤ پیدا ہوتا، اس لئے اس بحث کو ابتدا ہی مین روک دیا گیا اس لئے کہ انسانی
دماغ اس وقت تک اس کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا،

ہندو مذہب مین الگ الگ جسمانی و روحانی دنیا کا تصور نہین ہے، اُن کے عقیدے مین روح کا تعلق ہمیشہ
ایک نہ ایک جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے، جب ایک جسم سے روح کی جدائی کا وقت آتا ہے، تو اس کو چھوڑنے
سے پہلے وہ دوسرے جسم سے تعلق پیدا کر لیتی ہے، جیسے ایک تینگا ایک گھانس سے اپنی پچھلی ٹانگین اس وقت
اٹھاتا ہے، جب اگلی ٹانگین دوسری گھانس پر جما لیتا ہے، اسی طرح سلسلۂ تناسخ جاری رہتا ہے
روح جسم سے علحدہ ہو کر کسی خاص منزل پر جاگزین نہین ہوتی، اس کے برعکس اسلام نصرانیت اور
یہودیت یعنی سلسلۂ ابراہیمی کے ہر مذہب کا عقیدہ ہے، کہ روح جسم سے الگ ہو کر ایک دوسری دنیا
کو آباد کرتی ہے، اصلی روحانی دنیا یہی ہے، اس کی دو منزلین ہین، علیین اور سجین، علیین مین نیک
روحین اور سجین مین بد روحین رہتی ہین، اور دونون کے حالات بالکل مختلف ہوتے ہین، نیک روحین
راحت و سکون کے ساتھ رہتی ہین، اور بد روحین عذاب و تکلیف مین مبتلا، اسلام کی اس کھلی ہوئی تعلیم
کے باوجود حیرت ہے، کہ مسلمانون کا ایک طبقہ بھی عالمِ روحانیت کا قائل نہین، حالانکہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ
ہونا چاہئے، کہ مرنے کے بعد روحون کو راحت و عذاب کا سامنا ہوتا ہے، ان مین قوتِ احساس ہوتی
ہے، جن پر خدا کی رحمت ہوتی ہے، وہ مسرور ہوتی ہین، خدا کا شکر ادا کرتی ہین، اور جن پر عتاب ہوتا
ہے، وہ مضطرب اور پریشان رہتی ہین، اپنے اعمال کی برائیون کی وجہ سے نادم اور شرمندہ رہتی ہین
اور افسوس کرتی ہین،

وہ جماعت جو کسی مذہب سے تعلق نہین رکھتی، اگر روح اور روحانیت سے انکار کرے تو بجا ہے،

کیونکہ اس کے لئے غیر مرئی اور غیر محسوس اشیاء کا علم اور ماورائے طبیعیات امور کا تصور ناممکن ہے
ارباب مذہب کا تعلق تو کسی نہ کسی ایسی شخصیت سے ہوتا ہے جو عالم ماورائے طبیعیات سے وابستہ ہوتی
ہے اور بہت سی ایسی باتین بتاتی ہے، جہان تک ذہن انسانی کی رسائی نہین ہو سکتی ہے البتہ جو لوگ
مذہب سے تعلق نہین رکھتے، اُن کی رہبری محض فلسفہ اور سائنس کے اصول یا ذاتی تجربات سے ہو سکتی ہے
اس لئے آیندہ سطور مین صرف عقلی دلائل سے بحث کی جائے گی، اور روح اور روحانیت کے بارے مین
ان حکماء مادیات کی رائین پیش کی جائین گی، جنہون نے طبعی اور مادی تجربون اور تجزیون مین
کمال حاصل کرنے کے بعد روحانیت کے متعلق بھی تحقیقات و تجربے کئے ہین، اور ان تجربات و تحقیقات
کو شائع کیا ہے،

جنوری ۱۸۸۲ء مین روحانیت کی تحقیقات کے لئے لندن مین ایک ریسرچ سوسائٹی قائم کی گئی
پروفیسر بیرٹ (Barrett) اس کے محرک اور ڈاکٹر ہنری (Dr. Henry)
فریڈرک مائرس (Tredric myers) اور سر اولیور لوج (Ser Oliver lodge)
اس کے معین تھے، اور یہی لوگ یکے بعد دیگرے سوسائٹی کے صدر ہوتے گئے، اور غالباً یہ سوسائٹی اب
تک قائم ہے، ایک ضمیمہ مین اُن لوگون کے حالات اور تجربے الگ سے پیش کئے جائین گے، ان مین سے موخرالذکر
سر اولیور لوج سے موجودہ سائنس کی دنیا ناواقف نہین ہے، کیونکہ ایک عرصہ تک کیمبرج یونیورسٹی مین
طبعیات کے پروفیسر رہ چکے ہین، اور تقریباً ایک درجن کتابین علوم طبعیات کے مختلف عنوانون پر
لکھی ہین،

اس سوسائٹی کا مقصد روحانیت کے متعلق تحقیق و انکشاف کرنا تھا، اہل یورپ کا یہ خاصہ ہے کہ
جس کام مین پڑتے ہین، اس کو تکمیل تک پہنچائے بغیر نہین رہتے، چنانچہ ان لوگون نے بھی اپنا قیمتی وقت
اس کام مین صرف کیا، اور آخر مین روحون سے مراسلت کرنے مین کامیاب ہوئے، ان مین سے ہم چند

چند واقعات مختصراً پیش کرین گے، اور بعض مراسلات بھی درج کرین گے، تاکہ ناظرین کو ان پر غور و فکر کرنے
کا موقع ملے، ساتھ ساتھ ان مراسلات کا تجزیہ اور ان پر تنقید بھی ہوگی، کہ وہ کس حد تک لائق وثوق ہین

روح اور روحانیت انسانی زندگی کا نہایت اہم مسئلہ ہے، کیونکہ اس پر انسانی اخلاق و عمل کا دار و مدار
ہے اس وقت دنیا کی ساری پریشانیان روحانیت سے بے توجہی کا نتیجہ ہین، جب تک ہم روحانیت کی
طرف توجہ کرین گے، اور انسانی زندگی کا مقصد نہ سمجھین گے، اس وقت تک ہمارے اعمال کی اصلاح نہین ہو سکتی

اس مختصر مقالے مین یہ ممکن نہین کہ روحانی رسل و رسائل کے پورے اصول اور قواعد بتا دئے جائین
لیکن اس حد تک آگاہ کر دینا ضروری ہے، کہ ایک انسان روحانی عالم سے تعلق پیدا کر سکتا ہے، اور
وہان سے رسل و رسائل کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے، گذشتہ زمانہ مین تو یہ وہ راز تھا جس کو صرف
مرشد کامل اپنے خاص خاص مریدون کو بڑی جانچ پڑتال کے بعد بتلا کرتے تھے، لیکن اب سائنٹفک
تجربون کی طرح روحانی تجزیے اور عمل بھی عام ہو رہے ہین، اور وہ کسی جماعت یا کسی حلقہ کے ساتھ
مخصوص نہین ہین،

آپ کو معلوم ہوگا کہ صوفیائے کرام طالبین کو مراقبہ کی مشق کرانے کے بعد مکاشفات کی منزل
تک پہنچاتے تھے، مراقبہ کی پہلی شرط یہ تھی، کہ خدائے واحد و قدوس کی طرف توجہ کی جائے، اور اس مین
اس قدر انہماک پیدا کیا جائے، کہ انسان اپنے ماحول سے بالکل بے خبر ہو جائے، اس کی مشق کے لئے
خاص طور پر لا الہ الا اللہ کی ضرب لگانے کی تعلیم ہوتی تھی، اس کے بعد حبس دم کی تعلیم اور اس کی مشق
کرائی جاتی تھی، کیونکہ خیال کے ایک مرکز پر آ جانے کے بعد بھی سانس کی حرکت کے جھٹکون کے اثر سے
دماغی سکون مین کچھ خلل واقع ہو جاتا ہے، اگر خیال کے کسی مرکز کی طرف متوجہ ہو جانے اور سانس کی
حرکت رک لینے کے بعد ایک ایسا سکون پیدا ہو جاتا ہے، جس سے روحانی پرواز اس عالم متحرک
سے بالا ہو جاتی ہے، اور جہان موجودات کی رنگارنگی دلآویزیان بالکل محو ہو جاتی ہین، اگر پہلی منزل

ین تشخصات باقی رہتے ہین، یہی عالمِ ارواح ہے، جن کی منزلِ مقصود یہین تک ہے، وہ تو اس عالمِ ارواح کی سیر مین لگ جاتے ہین، لیکن جن کا مقصود تمام تشخصات سے بالاتر ہوتا ہے، وہ اس پہلی منزل کی دلچسپیون کی طرف مائل نہین ہوتے بلکہ آگے بڑھکر عالمِ جبروت تک پہنچ جاتے ہین، جہان ذات و صفات کا انکشاف ہوتا ہے، اور ذات واجب الوجود اپنے مختلف صفات اور کمالات کے پردہ مین نظر آتی ہے، گر ارباب حقیقت اس سے بھی آگے بڑھکر عالمِ لاہوت مین پہنچتے ہین، یہان پہنچ کر لاعین رات ولا اذن سمعت کا عالم نظر آتا ہے، جس کے بعد کوئی عالم نہین،

مجھے اس وقت عالمِ لاہوت کی بحث نہین چھیڑنی ہے، بلکہ عالمِ ملکوت کی سیر کرانی ہے، اور اس کے جدید سائنٹفک طریقے بتانے ہین اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک شخص خود اپنے آپ کو ٹرانس Trairce یعنی عالمِ محویت یا استغراق تک پہنچائے، اور دوسرا یہ ہے کہ کسی دوسرے پر محویت طاری کرے، اور اس عالمِ محویت مین عالمِ ارواح کی سیر کرانے لگے، موخر الذکر طریقہ سہل ہے، اور زیادہ تر اسی طریقہ سے سائیکیکل ریسرچ سوسائٹی (Psychichal Research.) نے مراسلات کئے ہین، پہلے طریقہ مین اپنی نگاہ کو کسی ایک نقطۂ ظاہری پر مرکوز کرکے محویت طاری کی جاتی ہے، اور سانس روکنے کی بھی مشق کرنی پڑتی ہے، لیکن سب سے پہلے اپنے آپ کو جذبات قبیحہ سے محفوظ خیالات و تصورات باطلہ سے پاک کرنا اور قوت ارادی کو بڑھانا ضروری ہے، ان شرائط کو پورا کرنے کے بعد محویت یا استغراق کی مشق کی جاتی ہے، جس سے دور دور کی چیزین نظر آنے لگتی ہین، اور عالمِ ارواح کی سیر ہونے لگتی ہے، اور قوت ارادی اتنی بڑھ جاتی ہے، کہ مشیت الٰہی کے سوا کوئی چیز اس کو زیر نہین کر سکتی، اسی طریقہ کو مسمریزم (mesmerism) کہتے ہین، کیونکہ اس کا موجد مسمر نامی تھا،

دوسرا طریقہ جس کو صوفیاے کرام توجہ کہتے ہین، وہ جدید فلسفۂ نفسیات مین ہپنوٹزم (Hypn-ot.ism) ہے، توجہ مین تو صوفیاے کرام خود مراقبہ کرکے توجہ فرماتے تھے، لیکن ہپنوٹزم مین عامل کی

معمول کو مسخر کر لیتے ہین، یہ حکمت عملی بہت آسان ہے، پہلے کوئی معمول منتخب کیا جائے، معمول ہوشمند لیکن نابالغ ہو، خواہ وہ بچہ ہو یا بچی، اگر عورت ہو تو کہولت کو پہنچ چکی ہو، وہ معمول زیادہ مفید ہوتا ہے جو مزاج کا ضدی نہ ہو، جس کی طبیعت زیادہ چنچل نہ ہو، تاکہ بلا مزاحمت خیالات پر خیالات اور تصورات پر تصورات آتے جائین، معمول کی طبیعت ایسی ہونی چاہئے، کہ دماغ کسی ایک نقطہ کی طرف متوجہ ہو سکے، مجھے ایک ایسے بزرگ پر عمل کرنا پڑا، جو سن مین مجھ سے تقریبًا دس بارہ برس بڑے تھے، وہ خود طبیب تھے، مگر ایک مرض کا مجھ سے علاج کرانا چاہتے تھے، اس لئے اُن کو معمول بنانے کے علاوہ چارہ کار نہ تھا، اس عمل مین کامیابی ہوئی، مگر کچھ دیر لگی، اور ان کا مرض بھی دفع ہو گیا، اور پھر کبھی نہین ہوا، اب وہ اس عالم سے گذر چکے ہین،

(باقی)

مدرسہ سراج العلوم کی امداد کیجئے

ضلع بستی مین نیپال کی ترائی کے مسلمانون کی مذہبی حالت ہمیشہ سے خراب چلی آرہی ہے اور اس نواح مین تنہا مدرسہ سراج العلوم ایک ایسا ادارہ ہے، جو ان مسلمانون کی تعلیمی و اصلاحی خدمت مین مصروف ہے، مگر دوسرے اسلامی مدارس کی طرح اس کی مالی حالت بھی ناقابل اطمینان ہے، اور اب اس کی عمارت کا ایک حصہ زیر تعمیر ہے، اس لئے اس کار خیر مین اہل خیر مسلمانون سے امداد کی استدعا ہے،

(مولانا) عبد الرؤف ناظم مدرسہ سراج العلوم جھنڈے نگر ڈاکخانہ رامدت گنج

(ضلع بستی)

استانبول کی موتمر مستشرقین عالم

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ — پاریس

حال مین ترکی جانے کا اتفاق ہوا، خیال ہوا کہ اس علمی سفر کے حالات دلچسپی سے خالی نہ سمجھے جائینگے
اس مقالے کے دو حصے ہین (۱) موتمر مستشرقین کا حالیہ اجلاس (۲) ترکی کے کتب خانے،
ناگزیر وجوہ سے محض ایک اطلاع کے طور پر یہ سطرین تحریر ہین،

یورپی جامعات مین مشرقی اور خاص کر اسلامی علوم کی تعلیم تو کئی سو سال سے ہو رہی ہے اور مشرقیات کی انجمنین بھی کئی مقامون پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے قائم ہین، لیکن کوئی بین الممالک انجمن نسبتہً حالیہ چیز ہے، اور پچاس سال سے بھی کم عرصہ ہوا، کہ موتمر مستشرقین عالم ؓ کے نام سے ایک یورپی ادارہ وجود مین آیا، ہر تین چار سال مین اس کا اجلاس ہوتا ہے، الجزائر کے بعد، یہ دوسری دفعہ ہے، کہ اس کا اجلاس گذشتہ ستمبر مین ایک اسلامی شہر (استانبول) مین ہوا، اس بائیسوین اجلاس مین ساری دنیا سے اہل علم جمع ہوئے، اور ہر حیثیت سے یہ سب سے کامیاب اجلاس رہا، ۱۵ ر تا ۲۲ ر ستمبر ۱۹۵۱ء ایک ہفتے صبح و شام ہر روز اس کی نشستین ہوتی رہین، کوئی تین سو کے اجتماع مین پاکستان سے تو صرف ایک شخص جامعہ

ؓ ہمارے محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دار المصنفین کے پرانے مخلص قدر دان ہین، وہ جہان بھی رہتے ہین اس کو نہین بھولتے، چنانچہ پیرس جیسے دور دراز مقام سے معارف کے لئے وقتہً فوقتہً علمی سوغات بھیجتے رہتے ہین، ابھی چند مہینے ہوئے، ان کا ایک علمی خط معارف مین شائع ہو چکا ہے، اب انھون نے موتمر مستشرقین عالم منعقدہ استانبول

پنجاب کے معین امیر آئے، لیکن حیدرآباد اور ہندوستان نے توقع سے زیادہ دلچسپی لی، جامعہ کلکتہ کے استاذ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے ناظرین ناواقف نہین، حکومت ہند کے پانچ نمایندون مین یہ اکیلے مسلمان تھے، حیدرآباد سے ہر شخص اپنے مصارف سے شوق علم مین آیا تھا اور اس کی قدر بھی کی گئی، چنانچہ دو نشستون کے صدر حیدرآبادی نامزد ہوئے تھے، ڈاکٹر نظام الدین تو آئے لیکن پروفیسر محمد عبد الرحمن خان نہ آسکے اس کی بنا پر وہ صدارت نہ کر سکے، جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر محمد غوث اور ڈاکٹر محمد یوسف الدین بھی آئے تھے، صدارت کے اعزاز مصر کے ڈاکٹر ابو نجا اور ڈاکٹر مراد کامل نیز ایران کے پروفیسر علی اصغر حکمت کو بھی عطا ہوئے تھے،

مقالے توقع سے اتنے زیادہ آئے کہ متعدد شعبون کو کئی کئی ذیلی شعبون مین تقسیم کرنا پڑا، چنانچہ اسلامیات کو ایک کی جگہ چار شعبون مین بانٹا گیا، مزید بران مشرق بعید مین سے ملایا و انڈونیشیا کو الگ کر کے مستقل شعبہ بنانا پڑا، قدیم اناطولیا کو دو، ترکیات کو تین، اور اسلامی فنون لطیفہ کو دو حصون مین تقسیم کرنا پڑا،

اجلاس مشترکہ یعنی جلسۂ عام مین ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) نے یہ بتایا کہ عربی فارسی مخطوطات کی اشاعت مین مشرق اور مغرب کس طرح تعاون کر سکتے ہین، ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان (استانبول) نے کہا کہ قرون متوسطہ کے مسلمان مورخ کس قدر ناقدانہ رویہ رکھتے تھے، اور ڈاکٹر گرامس (لائڈن) نے بتایا کہ اسلامی عمرانیات مین عام عمرانیات کے علاوہ کیا خاص اور زائد ابواب ہوتے ہین،

یہ تو ممکن نہین کہ جملہ مقالون کی (جو عربی، ترکی، نیز یورپی زبانون مین تھے) فہرست دی جائے، پھر ہم لیسے مسلمانون کی دلچسپی کی چیزین شمار سے باہر ہین، اسلئے مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کیجاتی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶) کی مختصر روداد اور ترکی کے متعلق متفرق مفید معلومات قلمبند کرکے بھیجے ہین، اس موتمر کا دعوت نامہ دار المصنفین کے نام بھی آیا تھا، مگر اس غریب ادارہ مین اتنے کثیر مصارف برداشت کرنے کی طاقت کہان ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بھیجی ہوئی سوغات مین ناظرین معارف کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ "م"

۱۔ حرّان اور پرمچہ کے آثار قدیمہ (پروفیسر لائڈ، انقرہ)

۲۔ سباؔ معین (یمن) کی تازہ کھدائیان (البرائٹ۔ بالٹی مور)

۳۔ زمانہ جاہلیت کی یمنی عورت، (بیسٹن۔ آکسفورڈ)

۴۔ فینقی حروف تہجی معین (یمن) سے لئے گئے (گیورگیف۔ بلغاریا صوفیا)

۵۔ المدونہ مین کتاب الغصب (دے لی لیا۔ روما)

۶۔ طوق الحمامۃ لابن حزم کے مشرقی مصادر (گرامیا گومیس۔ مجریطا، اندلس)

۷۔ الحکمۃ العروضیہ لابن سینا (پادری قنواتی۔ قاہرہ)

۸۔ جزیرہ مالطہ کی موجودہ زبان کا درجہ عربی بولیون مین (کوہین، پارس)

۹۔ ہندو ثقافت کا اثر عربی ادبیات پر (رائے چودھری کلکتہ)

۱۰۔ تاریخ ابن ایاس کے چند نو دستیاب شدہ اجزار (محمد مصطفےٰ۔ قاہرہ)

۱۱۔ انقرہ کے مخطوطات (بکر صدقی بایکل۔ انقرہ)

۱۲۔ جمہرۃ الانساب لابن حزم شائع کردہ لیوی پرووان سال کی بے شمار غلطیان،

(خلیل نیاچ۔ استانبول)

۱۳۔ سفرنامہ ابن فضلان قدیم جرمن معلومات کے ماخذ کے طور پر،

(گرافہ، باڈماٹن برگ جرمنی)

۱۴۔ ابافیون کے ریت مین غائب شدہ شہر سیدراتہ کی دریافت (میڈم فان برشم، جینیوا)

۱۵۔ خلفاء فاطمیین کے آداب و مراسم (کانار الجزائر)

۱۶۔ عماد الدین اصفہانی کی الفتح القسی (ماسے۔ پارس)

۱۷۔ الحاکم کی رصدگاہ مصر (آیدین سائلی۔ انقرہ)

۱۸۔ عربی و اسلامی طب (سارنیلی۔ نیپلز)

۱۹۔ ابو دلف کا رسالہ ثانیہ (مینورسکی، کیمبرج)

۲۰۔ ولی کشمیر میر سید علی ہمدانی (علی اصغر حکمت۔ طہران)

۲۱۔ فن تنقید کی ترقی مین قرآن کا حصہ (خلف اللہ۔ اسکندریہ)

۲۲۔ فقہ کی تاریخ (برون شوانگ۔ بورڈو، فرانس)

۲۳۔ اسلامی مشرق مین زراعت کا اثر زمین پر (ملیکے استانبول)

۲۴۔ زانی کے فرزند سے نکاح کی حرمت اسلام مین (شاخت، آکسفرڈ)

۲۵۔ ناصر خسرو کی جامع الحکمتین (کوربین۔ طہران)

۲۶۔ اسلام اور بنیادی حقوق انسانی (محمد غوث۔ حیدرآباد دکن)

۲۷۔ اسلامی قانون کی تاریخ پیدائش (گوئٹائن۔ اسرائیل)

۲۸۔ مقدمہ ابن خلدون کے نئے صحیح اڈیشن کی ضرورت (تادیت الطنجی، قاہرہ)

۲۹۔ اسلام اور سماجی جمہ (محمد یوسف الدین حیدرآباد دکن)

۳۰۔ فتوت تاریخ اسلام مین (ماسینون، پارس)

۳۱۔ دیوان حافظ کا قدیم ترین نسخہ کلکتہ مین ہے (زبیر صدیقی۔ کلکتہ)

۳۲۔ قبلائی قاآن کا جاوا پر حملہ (داماے۔ انڈو چائنا)

۳۳ پندرہوین اور سولہوین صدی کی ترکی مردم شماریان (عمر لطفی برکان۔ استانبول)

۳۴۔ ویانا (آسٹریا) مین سنہ ۱۷۶۶ء کی ترکی جبری فوجی خدمت (اینے بے کی ویس۔ ویانا)

۳۵۔ انیسوین صدی کے آغاز مین کوریکا یونانی کی جاسوسی ترکی مین، فرانسیسی وزیر خارجہ کی روشنی مین (ایضاً)

۳۶ - جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین خان کے حالاتِ فرنگ کے ماخذ (یان اوتوریشت، ہالینڈ)

۳۷ - بی بی مریم کی تاریخ مین دوسری صدی عیسوی کا ایک ترکی قصیدہ (سپالتی - استانبول)

۳۸ - قدیم چغتائی مین ایک ترجمہ قرآن مجید (فاخر عزّ - لندن)

۳۹ - قرہ قویونلو اور آق قویونلو (مینورسکی - کیمبرج)

۴۰ - "سیاست نامہ" کس حد تک اصلی ہے، (یحیی الخشاب قاہرہ)

۴۱ - پرانے ایران کا جاگیرداری نظام (ویڈن گرین - اپسالا - سویڈن)

۴۲ - تالمود اور حدیث کی مماثلتین (بانیت اسرائیل)

۴۳ - ایرانی سیاست اور یہود کی بابل سے واپسی، (گالنگ - مانس - جرمنی)

۴۴ - بحر میت کے پاس حال مین دستیاب شدہ قبل مسیح کا نسخہ توریت، (فاندر پلوگ، نیمیگن، ہالینڈ)

۴۵ - ایتھنس کی فاتحہ جامع مسجد (مافیکو - ایتھنس)

۴۶ - مسلمان مصورون کی سوانح عمریان مرتب کرنے کی ضرورت (مایر - اسرائیل)

۴۷ - فاطمی دور کے منقش مٹی کے برتن، (زکی حسن - قاہرہ)

۴۸ - قدیم غزنی مین ترکی فنون لطیفہ (ایٹنگ ہاز وین - واشنگٹن)

۴۹ - ترکی اثر مغلیہ فنون لطیفہ پر ہند مین (سپلے براون - پاریس)

۵۰ - استانبول کے قبرستانون کے کتبے (معین التاریخ استانبول)

۵۱ - عربی خط کا ولولہ خیز دور فنِ لطیف مین (ادحیم - استانبول)

۵۲ - ماخذ ہاے فقہ کا جدید مطالعہ (قرآن حدیث، اجماع اور قیاس کے علاوہ دیگر ایک ... تاریخ العقیدہ و فقہا کے ہان (ناچیز راقم الحروف)

مؤتمر نے متعدد قرار دادین بھی منظور کین کہ مختلف حکومتون سے خواہش کی جائے کہ وہ اپنے ہان کے کتبخانہ ہاے عمومی کے مخطوطات کی فہرستین شائع کرین، اور فوٹو لینے کے انتظامات کرین، مخطوطہ کتابون کے علاوہ دستاویزون کے مطالعہ پر اہل علم توجہ کرین، اسلامیات کا خصوصی مطالعہ کرنے والون کی ایک خصوصی انجمن بنائی جائے، مؤتمر آیندہ اجلاس انگلستان مین ہو، (جو تین یا چار سال بعد ہوگا)،

مؤتمر مستشرقین کے سلسلہ مین استانبول کے علاوہ درجن بھر دیگر ترکی شہرون مین بھی علمی نمائشین کی گئین، جن مین قلمی کتابین، تصویرین، قدیم آلات، وغیرہ وغیرہ بلا مبالغہ لاکھون کی تعداد مین جمع کی گئی تھین

آیندہ سال ۱۳۷۲ھ رجمادی الآخرہ کو مولانا روم کی وفات پر پانچ صدیان گذر رہی ہین، اور ۱۹۵۳ء عیسوی مین فتح قسطنطینیہ کی پانچ صد سالہ سالگرہ سرکاری طور پر ترکی مین منانے کا انتظام ہو رہا ہے یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ مکتوب مبارک نبوی بنام مقوقس موجود ہے، اور عجائب خانہ توپ قپو سرای مین کمرۂ آثار مبارک مین ایک سنہری صندوق مین عزت و احترام سے محفوظ ہے،

ترکی حکومت نے مہمانداری کے جو انتظامات کئے تھے، اس پر سارے یورپی و امریکی شرمندہ تھے کہ ان کے ہان اس کا عشر عشیر بھی نہین ہوتا[ل]،

مؤتمر کے شعبہ ہاے اسلامی نے جہان اور قرار دادین منظور کین، وہین یہ بھی تھی کہ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) کی خدمات کو وہ قدر کی نظر سے دیکھتے ہین، اور توقع کرتے ہین کہ وہ روز افزون پھلے

ل معارف: اس کے مقابلہ مین ہم ہندوستانیون کی میزبانی کا حال یہ ہے کہ ابھی گذشتہ اکتوبر مین آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا جو اجلاس لکھنؤ مین ہوا تھا، اور جس مین ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکون کے بعض نمایندے بھی آئے تھے، اس مین میزبانی کا جیسا انتظام تھا، اس کو دیکھکر گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی تھی کہ بیرونی ملکون کے نمایندون کا سوال تو الگ رہا، خود ہندوستان کے دوسرے صوبون کے بلند اور ستھری معاشرت کے لوگون نے اہل لکھنؤ کی میزبانی اور سلیقہ و تمیز کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی، مگر اس مین اہل لکھنؤ کا شکوہ

ہوے گا، اور اپنی خدمت علم کو سدا جاری رکھے گا،

ترکی کے کتب خانے خدا نظر بد سے بچائے، عالم اسلامی میں کتب خانوں کے لحاظ سے ترکی کا درجہ اتنا بلند ہو کہ باقی سب اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں، شاید یہ کہنا بھی ہر مبالغے سے خالی اور خالص حقیقت ہو کہ ساری دنیا کی عربی فارسی کی قلمی کتابیں، ایک طرف ہوں اور صرف ترکی کی ایک طرف تو بھی ترکی کا پلہ بھاری رہے گا،

۱۹۴۵ء کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ترکی کے چونسٹھ شہروں اور قصبوں میں ایسے عمومی کتب خانے ہیں جن میں مخطوطات موجود ہیں، اکیلے شہر استانبول میں ایک سو ترپن کتب خانے ہیں، حکومت اب ان کو یکجا کرتی جا رہی ہے، چنانچہ موتمر مستشرقین ۱۹۵۱ء کے موقع پر جو رہبر کتابچہ تقسیم کیا گیا اس کی تحریر کے مطابق استانبول کے یہ ڈیڑھ سو سے زائد کتب خانے اب صرف اٹھارہ عمارتوں میں اکٹھے ہو گئے ہیں، اکیلے کتب خانہ سلیمانیہ میں اب ترپن کتب خانے ہیں،

ان کتابوں کی صحیح تعداد بیان کرنی مختلف وجوہ سے مشکل ہے، ۱۹۴۵ء میں وزارت تعلیمات کی رپورٹ میں کوئی بیس ہزار ترکی، ایک لاکھ گیارہ ہزار عربی اور آٹھ ہزار فارسی قلمی کتابوں کا اندازہ کیا گیا تھا، اس فہرست میں انقرہ میں کوئی قلمی کتاب نہیں بتائی گئی ہے، اور میں نے وہاں کے کتب خانۂ عام میں آٹھ ہزار مخطوطات نیز جامعۂ انقرہ کے شعبۂ تاریخ و جغرافیہ میں [illegible] ہزار مخطوطات خود دیکھے، اسی طرح کتب خانہ جامعۂ استانبول کو اس شمار سے خارج رکھا گیا تھا، وہاں اس وقت سترہ ہزار سات سو تیئیس مخطوطے ہیں، اور جدید خریداری اور تحفوں کی وصولی کا سلسلہ بھی جاری ہے، یہ یاد رہے کہ مجموعۂ رسائل کو شمار میں صرف ایک کتاب فرض کیا جاتا ہے، اور بعض وقت ایک ایک جلد میں سو سو چھوٹے چھوٹے رسالے ہوتے ہیں، اور [illegible]ورتیں نادر نہیں، جب ان میں نادر روزگار کتابیں ہوں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱) بے کار ہے، اس لئے کہ کمتر جن لوگوں سے عبارت بنی دہ، اس میں دخیل ہی نہ تھے،

ان دو مرکزوں کے علاوہ بروصہ اور قونیہ میں سے (جہاں مولانا رومؒ کا مزار ہے) ہر ایک میں پانچ پانچ چھ چھ ہزار مخطوطات ہیں، ان مقاموں کے علاوہ راقم کو افیون قرہ حصار، بالکیسر، منیسی شہر، چوروم کی شہر، قسطمونی، قیصری، کوتاہیہ، درتنیا جانے کا موقع ملا، لیکن حسرت رہی کہ ازمیر (سمرنا) اور ادرنہ (اڈریانوپل) اماسیہ، چنکیری، اسپارتا، ملطیہ اور سمسون جانا نہ ہو سکا، جہاں ہر ایک میں ہزاروں مخطوطات ہیں، کیا عجب ہے کہ جہاں تعداد کم ہے، وہیں گودڑ میں لال چھپے ہوئے ہوں، خانگی ذخیروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے،

ترکی جانے کا مقصد موتمر مستشرقین کی شرکت کے بعد چند معین مخطوطات سے استفادہ کرنا، اور دینوری کی کتاب النبات کو ایڈٹ کرنے کے سلسلہ میں ان کی جانب توجہ کرنا تھا، یہی وجہ ہے کہ دو مہینوں کے قیام، اور درجن بھر سے زائد مقاموں کے سفر کے باوجود بہت زیادہ کتابیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا، فہرستیں دیکھیں، چند نام نوٹ کئے، اور ان میں سے بھی چند منتخب کو منگوا کر ورق گردانی کی، بہرحال اپنی یادداشت میں سے چند کا ذکر ناظرین کے لئے کرتا ہوں

فقہ

۱. کفایۃ المنتہی: مؤلفہ مرغینانی (صاحب ہدایہ) اس نادر روزگار کتاب کے نسخے جامع استانبول اور با قونیہ میں ہیں، یہ ہدایہ کی بعد کی تالیف ہے، لیکن توقع کے برخلاف زیادہ بڑی نہیں، چار سو سے بھی کم ورق ہیں، قامت کہتر ہو تو کیا ضرور ہی ہے، کہ قیمت بھی کمتر ہو،

۲. التجنیس والمزید، مؤلفہ الضیا، استانبول، بروصہ، قونیہ وغیرہ میں متعدد نسخے ہیں،

۳. کتاب الرسوم: مؤلفہ عبدالرحمن بن نصر بن عبداللہ (بروصہ وانقرہ) یہ فن حسبہ کی نظری نہیں، بلکہ عملی کتاب ہے، اور ان تمام محاصل کا ذکر ہے، جو مختلف اہل پیشہ سے وصول کئے جاتے تھے، مثلاً شاہراہ، پل، غلہ فروش، نانبائی، قصاب، حلوائی، دوا فروش، عطار، ماہی فروش، گوالے، بزاز، درزی، رنگریز، موچی، صراف، سنار، طبیب حیوانات، غلام جانور فروش، حمام، فصد کھولنے والے، طبیب، موذ

موقوبِ صبیان (استاد) اہلِ ذمہ وغیرہ، ہر اہلِ پیشہ کی چالبازیون، اور اہلِ حسبہ کی نگرانی سے بھی

بحث ہے،

۴- نہایۃُ المجتہد وکفایۃ المقتصد مولفہ ابن رشد (قونیہ دو جلد)

یہ گویا بدایۃ المجتہد کا تکملہ ہے، اس نسخہ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ حضرت محی الدین ابن

عربی رہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، نیز (روایۃ محمد بن علی بن محمد بن احمد ابن العربی الطائی الحاتمی عنہ اجازۃ

ومناولۃ

۵- اصول الفقہ، مولفہ موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (قونیہ)

حنبلی اصولِ فقہ پر نفیس کتاب ہے،

۶- شرح القدوری للاقطع: المتوفی ۴۷۴ھ دو جلد (قونیہ)

۷- آدابُ القضاۃ للخصّاف (قونیہ)

۸- شرح مختصر الکرخی: مولفہ قدوری، (بروصہ)

۹- کتاب التجرید: مولفہ قدوری (وہبی، استانبول)

قرآنیات ۱- تفسیر البسیط للواحدی: (۱۰۰۵) ورق۔ (قونیہ)

ان کی تفسیر وجیز کے نسخے زیادہ ملتے ہین، مگر تفسیر بسیط بہت کمیاب ہے،

۲- تفسیریات پر سترہ رسائل کا ایک ضخیم مجموعہ (قونیہ)

اہم تر رسالے یہ ہین، :-

۱- ترتیب التیسیر فی قواعد علم التفسیر۔ بزمانہ الملک الظاہر چقمق،

۲- الناسخ والمنسوخ لابن سلامہ البغدادی المتوفی ۴۱۰ھ

۳- الاکلیل للسیوطی (۴) احکام القرآن لسراج الدین درویش بن قاسم

نقل ۹۰۶ھ، (۵) تبیان مولفہ نووی (۶) الجواہر المصون للشعرانی، (۷) اسباب

النزول للواحدی (۸) تاویلات مشکل القرآن لابن قتیبہ (۹) التعریف للسہیلی

صاحب روض الانف (۱۰) برہان القرآن لما فیہ من الحجۃ والبیان لمحمود

بن حمزۃ المقری الکنانی المتوفی ۵۰۵ھ (۱۱) المتشابہات للراغب الاصفہانی

۳- تفسیر امام الحرمین الجوینی (جامعۂ استانبول)

۴- احکام القرآن مولفہ بیضاوی، مشہور تفسیر بیضاوی کے مولف ہی کی تالیف (کوتاہیہ) دو جلدین

۵- امثال القرآن مولفہ امام ماوردی (بروصہ)

۶- تفسیر ابن عربی (ابالی کیسر) اثنی جلدون مین سے صرف ایک جلد،

طرفات ۱- کتاب الذخائر والتحف (افیون قرہ حصار) مختلف بادشاہون وغیرہ نے جو تحفے بھیجے ان

کی دلچسپ تفصیل اور دوسرے معلومات ہین،

۲- معدن الجواہر (قونیہ) بصرہ اور جزائر خلیج فارس کے حالات،

۳- تاریخ صفد (جامعہ استانبول) شہر صفد، صور، عکہ، ناصرہ، طبریہ، غلیث وغیرہ کے حالات،

۴- کتاب المفردات للادریسی (محمد فاتح استانبول) یہ مشہور مولف ادریسی کی جڑی بوٹیون پر ایک

اہم کتاب ہے،

۵- کتاب الصیدنہ للبیرونی (بروصہ) دواسازی پر کتاب،

۶- کتاب الجفر للبیرونی (قونیہ) علم جفر پر بیرونی جیسے شخص نے جو کچھ لکھا ہو، وہ لغویت نہین ہو سکتی،

۷- جواہر نامہ مولفہ نصیر الدین طوسی (انقرہ) فارسی، جواہر شناسی پر نفیس رسالہ ہے،

۸- عجائب الدنیا مولفہ مسعودی (بروصہ)

۹- اخبار الزمان مولفہ مسعودی (قسطمونی) مسعودی کی کم چیزین بچی ہین،

۱۰۔ ۱۰۔ غریب الحدیث مؤلفہ ابو عبید القاسم بن سلام (چور وم)

۳۱۹ھ کا مخطوطہ ہے، ابتدائی چند ورق موجود نہین ہین اور بیشمار اجازتین، اور سماعات ہین،

۱۱۔ غریبی القرآن والسنۃ، مؤلفہ ابو عبید (قونیہ)

۱۲۔ اخبار خالد بن ولید مؤلفہ محمد بن ابراہیم بن یوسف الحنبلی نقل ۹۶۳ھ (قونیہ)

۱۳۔ مجموعۂ الف) کتاب المقصور والممدود لابی العباس بن ولاد،

(ب) کتاب المذکر والمونث لابی حاتم السجستانی (قونیہ) ۲۸۳ھ کا مخطوطہ،

۱۴۔ مولانا روم کے مزار پر شہر قونیہ مین جو عجائب خانہ کھولا گیا ہے، اس مین نہ صرف مولانا کے استعمالی ملبوسات ہین، بلکہ مثنوی شریف و ملفوظات اور کتاب فیہ ما فیہ کے قدیم ترین نسخے بھی ہین، انمین متعدد فارسی تراجم قرآن ہین جن مین ایک پر ۶۰۳ھ درج ہے، گویا مولانا روم کی ولادت سے بھی ایک سال پہلے کا نسخہ ہے،

۱۵۔ کتاب لحشائش بالتصویر (توپ قپو سرای استانبول) نباتات کے خواص اور انکی نہایت نفیس تصویرین ہین،

۱۶۔ مسالک الابصار مؤلفہ ابن فضل اللہ العمری (آیا صوفیا) اس کا ایک ٹکڑا چھپا ہے، یہان جلد (۲) تا ۲۷ ہین، ہر فن کے معلومات کی انسائیکلوپیڈیا ہے، ایک باب ہندوستان پر بھی ہے، نیز اطبار کے حالات مین بھی ایک فصل ہندوستان پر ہے، بعض ٹکڑے جامع استانبول و انقرہ مین بھی ہین،

۱۷۔ جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین خان (توپ قپو استانبول) بہت بڑی تقطیع اور نہایت نفیس تصویرون کی حامل اور تالیف کے صرف دس سال بعد کی نقل اور مکمل ہے، اس کا ہند و کشمیر و بدھ مت کا حصہ ہالینڈ کا پروفیسر یان شائع کرنے والا ہے،

۱۸۔ کتاب المطر والرعد (کوپریلو استانبول)

کاغذ پر تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی ہے، اسے پر کرنے کے لئے عنوان سے غیر متعلق چیزین بھی درج کرتا ہون، مین نے ۱۹۳۲ء مین ترکی مین تین ماہ گذارے تھے، اس انیس سال مین جو تبدیلیان ہوئی ہین، ان کا اکثر حصہ خوشگوار ہے، مذہبیت بہت بڑھ گئی ہے، اور الحمد للہ نماز کا شوق نوجوانون مین زیادہ ہو گیا ہے، تین چار بڑے شہرون کو چھوڑ کر باقی ملک مین شراب خانے نا پید ہین، صنعت و زراعت مین خاص ترقی ہوئی ہے، لیکن بعض پہلو افسوسناک بھی ہین، ملک کی آزادی اب باقی نہین رہی، اور ترکی وزراء اپنے ضمیر کے خلاف دشمنون کے حسب الحکم راے دینے پر اپنے کو مجبور پاتے ہین، یہودی اثر ہر جگہ غالب ہے، کمال پاشا کے دور مین بھی یہودی وزراء ہی کار فرما تھے، ہمین دوسرے نام کی بنا پر اندازہ نہین ہوتا تھا جاوید پاشا وزیر مالیات (جسے کمال پاشا کی جان کے خلاف سازش کرنے کے الزام مین پھانسی دی گئی،) توفیق رشدی آراس (سابق وزیر خارجہ) خالدہ ادیب خانم سب یہودی ہی تھے، یا ہین، اب بھی ملک کی تجارت یہودیون ہی کے ہاتھ مین ہے، دولتمند صرف وہی ہین،

چند ماہ ہوئے معارف مین میرا ایک خط چھاپا گیا تھا، جس مین رسم الخط کے بعض مسائل سے بحث تھی، استانبول مین مشہور عربی لغت العباب مؤلفہ صنعانی دیکھ رہا تھا کہ اس مین جا بجا معرب الفاظ کی اصل نظر سے گذری، مؤلف کے ہاتھ کے مخطوطے مین (گ) کو (ک) لکھا گیا ہے، ایسا ایک اقتباس، جو کچھ اور تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے درج ذیل ہے،

"والقصیر... جزیرۃ صغیرۃ عالیۃ — جزیرۂ قیصر خلیج فارس مین جزیرۂ ہنگام
قریبۃ من جزیرۃ ھنکام فی بحر فارس — کے قریب ہے، الجہ (صغانی) سے وہان
قال الصغانی مؤلف ھذا الکتاب ذکرلی — ۶۱۳ھ مین شیخ جزیرۂ ابراہیم ہنگامی نے

ہ معارف :- اگر اس سے مراد مشہور و معروف خالدہ ادیب خانم ہین، جو چودہ برس پہلے ہندوستان آچکی ہین تو یہ انکشاف بالکل نیا ہے، اس لئے کہ وہ تو بظاہر مسلمان تھین، ممکن ہو نسلاً یہودی رہی ہون یا اس نام کی کوئی اور خاتون ہون،

بوغم هنگام حی رحمة الله شیخ جزیرة
هنگام بها سنة اربع عشرة و
سمة آن جزیرة القصیر مقام الابدال
والابرار ومن رویت له الارض،
ولیس بها ساکن. ومن ارسی بها
یراهم ویغیبون عنه. واشار لی
الیها من هنگام نظالت فنراءت
لی بعد لای. ولو املک زمام
امری لو کبت الیها سواری الغمام
وتشبثت باذیال الریاح ولکنی
کنت حملت الرسالة الی الهند
من بغداد وما ابعد السند
من سنداد،

بیان کیا، کہ جزیرہ قصیر مین ابدال
وابرار اور وہ لوگ رہتے ہین جن
سے روے زمین کی کوئی چیز چھپی نہین
رہتی، اور وہان کوئی آبادی نہین ہے
اگر کوئی جہاز وہان لنگر ڈالے تو وہ لوگ
دکھائی دیتے ہین، پھر غائب ہوجاتے ہین،
پھر شیخ نے اشارے سے بتایا بڑی دیر کے
بعد مین نے اسے دور سے دیکھا اگر مین اپنے
کام کا مختار ہوتا، تو بادلون کے ستونون
پر سوار ہوکر اور ہوا کے دامن مین چمٹ
کر وہان جاتا، لیکن بغداد سے مجھے سفارت
پر ہندوستان (سندھ) بھیجا گیا تھا اور سندھ
اور سنداد قریب نہین ہین،

ماہنامہ خاور ڈھاکہ

(مرتب ڈاکٹر عندلیب شادانی)

آپ کی خدمت مین ہر ماہ معیاری ادب پیش کرے گا، مارچ ۱۹۵۲ء سے منظر عام پر آرہا ہے، اُس کا مقصد زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سوا اور کچھ نہین اس سے تعاون آپ کا فرض ہے، مشرقی پاکستان کے اس واحد اردو ماہنامہ کی ترقی زبان و ادب کی ترقی ہے، قیمت ہندوستان کے لئے سالانہ نو روپے، پاکستان کے لئے سالانہ سات روپے فی پرچہ علی الترتیب ۱۲ اور ۱۲ آنہ، منیجر خاور ۳۱ نیل کھیت روڈ رمنا ڈھاکہ،

حضرت مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اور

بریلی کا کتب خانہ

از مولانا سید بدر الدین صاحب استاذ عربی مسلم یونیورسٹی

معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۵۱ء مین میرا مضمون بعنوان "سو سال پہلے کے اخبارات مین میرے اساتذہ کا ذکر" جب نکلا تو میرے کرم فرما سجن لال صاحب نے اس کو دیکھکر مجھے لکھا کہ اگر مین ان کو بریلی کے کتب خانہ کی بابت استفسار حال کے لیے لکھدیتا تو موصوف حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق اس سے بھی بحوالہ قدیم اخبار مجھکو تبلادیتے، مین نے اس کا جواب یہ لکھا کہ اب کیا گیا ہے، اب تبلا دیجئے دوسرا مضمون تیار ہو جائے گا، خدا اس کرم فرما کو سلامت رکھے جس کے ذریعہ سے یہ سعادت بار بار نصیب ہوتی رہے کہ قلم اپنے اساتذۂ کرام کے موضوع پر جنبش کر سکے، سجن لال صاحب نے اس پر خود علی گڑھ تک سفر کرنے اور اصل اخبارات کی جلدین توڑ کر حوالہ جات مجھکو دینے کی زحمت گوارا کی جس کے لیے شکریہ ادا کرنے کو میرے پاس الفاظ نہین،

فرزند سعید ڈاکٹر سید محمد ضیاء الدین علوی مدعمرہٗ دو سال سے بریلی کالج مین جغرافیہ کے لکچرار ہین،

لہ اخیر دسمبر ۱۹۵۱ء مین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کا اجلاس جے پور مین تھا، سجن لال صاحب اس مین شرکت کیلئے جے پور آئے تھے، وہان سے علی گڑھ تک آنے کی زحمت میری خاطر سے گوارا کی جس کی وجہ علم دوستی اور شاگرد نوازی کے علاوہ کچھ نہین، کثّر اللہ فینا مثلہ

اس تقریب سے مارچ ۱۹۵۱ء مین میرا جانا بریلی ہوا، جب گاڑی پہنچنے کو ہوئی اور کمپارٹمنٹ کے مسافرون نے اپنے اپنے ٹھکانون کو جانے کا ذکر شروع کیا تو اس ضمن مین کئی رفیقون سے "کتبخانہ" سن کر مین نے استفسار کیا کہ کتب خانہ کیسا؟ اس پر جواب ملا کہ واقعۃً ایک کتب خانہ ہے اور اس کے گرد و پیش کا پورا حصہ اسی نام سے مشہور ہے، چنانچہ اسٹیشن سے نکلکر تانگے اور رکشا والون کو مختلف مقامات کے نام پکارنے مین کتبخانہ کا نام بھی سنا، برخوردار موصوف اسٹیشن پر موجود تھے، استفسار کرکے ان سے بھی تصدیق کی، اور دوران قیام مین کتب خانہ دکھلانے کو بھی ان سے کہا، چنانچہ ایک دن شام کو کتب خانہ مقصود قرار پایا، ایک بالاخانہ پر بہت بڑا ہال ہے، جس مین تینون جانب دیوارون سے ملی ہوئی بکثرت الماریان رکھی ہوئی ہین، بیچ مین بڑی بڑی میزین کرسیون کے ساتھ پڑی ہین، جن پر اخبارات پڑھتے ہوئے لوگ نظر پڑے، مین نے پورے کمرے کا چکر لگا کر سب الماریون کی کتابون پر شیشون سے نظر ڈالی، بیشتر کتابین انگریزی کی ہین، کچھ مشرقیات کی بھی دکھائی دین، اور فکر ہوئی کہ فہرست لے، ایک صاحب نے جو باہر برآمدہ مین بیٹھے تھے، مطالبہ کرنے پر عربی، فارسی و اردو کی فہرست پیش کی، جو کچھ اچھی حالت مین نہ تھی، مین نے پوری فہرست سرسری طور پر دیکھ ڈالی، کوئی چیز ایسی نہ ملی جس کو نوٹ کرتا، اسکے بعد مین نے، اس کتب خانہ کی تاریخ معلوم کرنا چاہی، مگر کوئی صاحب نہ بتا سکے، نہ اندرون کتب خانہ نہ بیرون کتب خانہ، اور مین اپنا شوق دل ہی دل مین لیے رہ گیا، معارف مین مضمون محولۂ بالا نکلنے کے بعد جب سجن لال صاحب کا خط ملا تو خوشی ہوئی کہ کتب خانہ بریلی کی تاریخ معلوم ہو جائے گی، اور یہ خوشی بالخصوص اس وجہ سے کئی گونہ بڑھ گئی کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق بھی اس کتب خانہ سے نکل آیا،

اس طویل تمہید کے بعد اب مین سجن لال صاحب سے ملے ہوئے مواد کی بنیاد پر کتب خانہ بریلی کی تاسیس کا حال درج کرتا ہون، اس کو شروع کرنے سے قبل یہ بتا دینا مناسب ہے کہ بریلی سے

ایک اردو اخبار عمدۃ الاخبار نامی قدیم زمانہ مین باہتمام منشی لچھمن پرشاد نکلتا تھا، اسی کے مختلف پرچون سے بحوالہ تاریخ و سنہ واقعات درج ہون گے،

عمدۃ الاخبار مورخہ یکم جنوری ۱۸۵۵ء مین سب سے پہلے اس کتب خانہ کا ذکر اس طور پر ہے کہ مسٹر ہارن جوائنٹ مجسٹریٹ مع چند دیگر رؤسائے شہر بریلی ایک کتب خانہ قائم کرنے کا ارادہ کر رہے ہین، اور ۲۰ جنوری سنہ مذکور کو ایک جلسہ کا اعلان کیا جاتا ہے، جس مین قیام کتب خانہ کے لیے ایک کمیٹی بنے گی، اور ممبران کمیٹی کا انتخاب عمل مین آئیگا، ۲۲ جنوری سنہ مذکور کے پرچہ مین اس موعودہ جلسے کی روداد شائع ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر ہارن نے کوئی مضمون انگریزی مین لکھا تھا، وہ اردو مین ترجمہ کرکے سنایا گیا، میرے لیے سرمایۂ دلچسپی یہ چیز ہے کہ اس جلسہ مین حضرت مفتی عنایت احمد صاحبؒ شریک تھے، اور جو کمیٹی قیام کتب خانہ کے لیے بنی اس کے ممبران مین بھی حضرت کا اسم گرامی رکھا گیا،

۵ مارچ سنہ مذکور کے پرچہ مین ہے کہ اس کمیٹی کا اجلاس ۱۶ فروری کو ہوا، جسمین کلکٹر سے درخواست کی گئی کہ بالاخانہ دروازہ کوتوالی جدید کتب خانہ کے لیے مل جائے، چنانچہ درخواست منظور ہوئی، اور یکم مارچ ۱۸۵۵ء سے کتب خانہ کا افتتاح ہو گیا، اسی پرچہ مین معطیان کتب کے نام مع مختصر فہرست عطیہ کے درج ہین، چنانچہ اس مین نظر آیا کہ حضرت مفتی صاحب نے نقشہ مواقع النجوم ایک پرت عطا فرمایا، آیندہ جب بریلی جانا ہوگا تو انشاء اللہ اس نقشے کو تلاش کرون گا، اگر مل گیا تو سر اور آنکھوں سے لگا کر اس کے متعلق ایک مضمون ناظرین کرام کی خدمت مین پیش کرون گا، جس سے اس کی حقیقت منکشف ہوگی،

اب مین تبرکاً استاذ الاستاذ حضرت مفتی صاحب اور اپنے حضرت استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہما کے چند واقعات لکھنے کی سعادت حاصل کرتا ہون،

حضرت مفتی عنایت احمد صاحبؒ دیوہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، لیکن کسی طور پر کاکوری ضلع لکھنؤ مین متوطن ہو کر کاکوروی کہلائے جاتے تھے، اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق اساتذہ سے تمام علوم کی تکمیل فرمائی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو اس وقت ہندوستان مین حکمران تھی، عدالت دیوانی کے حکام کے ذمہ ایک خدمت مسلمانون کے لیے افتا کی بھی رکھی تھی، جو مسلمان حکام یہ خدمت انجام دیتے تھے، ان کو مفتی کا لقب دیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت قصبہ کول ضلع علی گڈھ مین منصف عدالت دیوانی اور مفتی مقرر ہو گئے، علمی اور تدریسی ذوق کے باعث فرصت کے اوقات مین درس دیا کرتے، بلکہ عدالت مین بحالت پیشی مقدمات بھی جو وقت ملتا، مثلاً ایک گواہ کے بعد جتنی دیر مین دوسرا گواہ آئے اس وقت کو ضائع نہ فرماتے، طلبہ، اجلاس مین حاضر رہتے اور وقت ملتے ہی ان کو اشارہ ہوتا اور سبق شروع کر دیتے، کمال ملاحظہ کیجئے کہ فقہ کی ہدایہ جیسی عظیم المرتبت کتاب کا درس ایسے اوقات مین ہوا کرتا، استاذ العلما حضرت مفتی لطف اللہ صاحبؒ کے والد مولوی اسداللہ عدالت دیوانی مین وکیل تھے، اسی سلسلے اپنے اکلوتے ہونہار فرزند کو بغرض تعلیم مفتی صاحب کی خدمت مین پیش کیا، جنھون نے جوہر قابل دیکھکر توجہ سے پڑھانا شروع کیا، حضرت استاذ العلما فرماتے تھے کہ فال نیک یہ ہوئی کہ حسن اتفاق سے پہلا سبق جو حضرت مفتی صاحب کی خدمت مین ہوا وہ منشعب کے باب کَرُمَ یَکْرُمُ کا تھا، آگے چلکر یہ کرامت یون ظاہر ہوئی کہ تلمیذ رشید سے ایک عالم کو فضل و کمال کا فیض حاصل ہوا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ مفتی صاحب کس سنہ مین منصف اور مفتی مقرر ہوئے، ۱۸۵۲ء مین مدرسہ عربیہ کے سلسلے سے ان کا علی گڈھ مین ان عہدون پر ہونا معارف کے محولۂ بالا مضمون سے ثابت ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ عرصہ تک ان عہدون پر علی گڈھ مین رہے، اس کے بعد یہان سے ترقی پر بعہدۂ صدر امین بریلی کا تبادلہ ہوا، یہ عہدہ منصف اور صدر الصدور کے درمیان ہوتا تھا، بعد مین صدر الصدوری پر بھی فائز ہوئے، جیسا کہ مضمون محولہ

مین ایک جگہ ان کو صدر الصدور لکھا ہے، جس وقت بریلی تبادلہ ہوا حضرت استاذ العلما کی کتابین ختم نہ ہوئی تھین، لہٰذا تلمیذ رشید نے شفیق استاذ کی رفاقت فرمائی، اور بریلی مین رہ کر تکمیل کی۔

کتب خانہ بریلی کے سلسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۵ء سے قبل مفتی صاحب وہان پہنچ چکے تھے، ۱۸۵۷ء مین بغاوت ہوئی، اور مفتی صاحب کو بالزام بغاوت ناحق گرفتار کرکے جزیرہ انڈمان بھیجدیا گیا، اچانک گرفتاری کی وجہ سے جیسے بیٹھے ہوئے تھے اٹھکر ساتھ ہو لیے، کوئی کتاب تک ساتھ نہ لے سکے، خیال کرنے کی بات ہے جسکا سارا وقت علمی مشاغل مین گذرتا ہو، بغیر کتاب کے اس طویل سفر اور قیام کی غیر متعین مدت مین اس پر کیا گذری ہوگی، مگر دیکھیے کہ عاشق علم نے اس منحوس جگہ مین بھی اپنی دلچسپی کا سامان کر لیا، کہ ایک صاحب حافظ وزیر علی کو پڑھانے کے لیے صرف کی جامع کتاب علم الصیغہ لکھ ڈالی کہ جو تنہا دوسری کتابون سے طالبعلم کو بے نیاز کر دیتی ہے، دوسرے محض یادداشت سے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر تواریخ حبیب الٰہ لکھی، جس مین واقعات بقید وقت و تاریخ و سنہ درج کیے ہین، یہ دونون نام حسب عادت شریفہ تاریخی رکھے، اس کے علاوہ جغرافیہ کی کتاب تقویم البلدان جو ۱۸۴۶ء مین بمقام پیرس چھپی تھی، جزیرہ انڈمان کے ایک بڑے افسر انگریز کی خواہش پر اس کا اردو ترجمہ کر ڈالا، اس ترجمے کے متعلق میرا ایک مضمون الندوہ لکھنؤ سلسلہ جدید بابت ماہ مئی ۱۹۴۰ء مین نکلا تھا، بہر حال افسر نے وعدہ کیا تھا کہ ترجمہ پورا ہوتے ہی رہائی مل جائے گی، چنانچہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور محض وعدہ ہی پورا نہین کیا، بلکہ بحالی اور صدر الصدوری پر دوبارہ فائز ہونے کا پروانہ بھی منگا کر پیش کیا، مگر حضرت نے پروانہ کو قبول کرنے سے معذرت فرمائی، بالآخر افسر کے اصرار پر لے لیا لیکن جہاز مین بیٹھتے ہی اس کو پھاڑ کر سمندر مین پھینک دیا، اللہ اکبر! یہ تھی ہمت اور اولوالعزمی کہ آٹھ سو روپیے کی صدر الصدوری پر لات مار دی، ہندوستان واپس آکر کانپور مین مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی (جو اب فیض عام انٹرمیڈیٹ کالج ہے) اور درس علوم کی خدمت اپنے ذمہ

لیکر محض پچیس روپے ماہانہ اپنے لیے مقرر کیے، کیا آج کوئی نظیر اس کی مل سکتی ہے؟

مدرسہ فیض عام مین اپنے دو جلیل القدر شاگردون کو بھی مدرس مقرر فرمایا، ایک مولانا سید حسین شاہ بخاری جو بعد مین سلطان جہان بیگم والیۂ بھوپال کے اتالیق مقرر ہوئے، اور بھوپال ہی مین انتقال کیا سید صاحب کی یادگار ایک بے مثل کتاب خلوۃ المنود موجود ہے، افسوس کہ وہ آج نایاب ہے، حضرت الاستاذ العلماؒ نے مجھکو ایک لطیف رباعی سید صاحب کی سنائی تھی، اس موقع پر اس کو نذر ناظرین کرنا غنیمت خیال کرتا ہون:

ذوقِ طلب فضل و کمال ست مرا | قطع نظر از مال و منال است مرا
آن مال کہ در ضمنِ کمال آمدہ ست | مال ست مرا چہ طرفہ مال است مرا

دوسرے مدرس حضرت الاستاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ برس کانپور مین درس دیکر اپنے علی گڈھ کے مدرسہ کو سرچشمہ فیض بنایا، ہان جب حضرت مفتی صاحبؒ جزیرے سے واپس آئے تو تلمیذ رشید حضرت استاذ العلما نے دو رباعیان لکھین ایک فارسی مشتمل بر تاریخ

جو بفضل خالق ارض و سما | اوستادم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاصِ آن جناب | بر نوشتم ان استاذی نجا

دوسری اردو

بہلاؤن کہان تک دل ناشاد کو مین | کب تک کرون ضبط آہ و فریاد کو مین
انشاء اللہ ایک ہفتے کے بعد | آتا ہون قدمبوسیِ استاد کو مین

قصہ مختصر کانپور مین حضرت مفتی صاحب نے چندے قیام فرما کر حج کا عزم کیا، قضا الٰہی سے احرام کی میقات سے آگے نکل کر جہاز غرق ہوگیا، کوئی شخص جو اس جہاز والون مین سے بچکر آیا تھا، اس نے بیان کیا کہ جب جہاز غرق ہونے لگا تو مفتی صاحب نے نماز کی نیت باندھکر نماز شروع کر دی اور بحالت

احرام و نماز غریق و شہید ہوئے، اس طور پر قیامت تک ان کے لیے حج ہوتا رہے گا، حضرت استاذ العلما کو جو محبت اور عقیدت اپنے شفیق استاذ کے ساتھ تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بحالت نابینائی اور معذوری جب کہ مجھکو پڑھاتے تھے، اس واقعہ کو گذرے ہوئے ایک طویل زمانہ ہوچکا تھا مگر جب مجھ سے ان کا ذکر فرماتے، چشم پرآب ہو جاتے جس کا اثر بات مین بھی ظاہر ہوتا، فرماتے کہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دوران قیام انڈمان مین اکثر مختلف چھوٹے جزیرون مین تبادلہ ہوتا رہتا، چنانچہ جب جہاز مین بٹھلا کر ادھر سے اُدھر بھیجا جاتا تو صعوبات کی وجہ سے کسی وقت یہ خیال گذرتا کہ کاش یہ جہاز غرق ہو جاتا، تو اس غم سے رہائی ملتی، اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے بہتری کی حالت مین جہاز غرق ہونے کی تمنا پوری فرمائی، کیونکہ اس وقت اگر جہاز غرق ہوتا تو اس سے یہ بات کہان حاصل ہوتی، جو اب حاصل ہوئی کہ قیامت تک ان کے لیے حج کا ثواب ملتا رہے گا۔

الغرض راقم الحروف کے خاندان شاگردی مین استاذ کی محبت اور عقیدت بھی ایک بڑی میراث ہے جو بلا طلب ملتی چلی آتی ہے، کاش آیندہ نسل مین بھی یہ میراث قائم رہتی،

ہان بریلی کے زمانہ قیام مین ایک بڑا نمایان کام حضرت کا یہ ہے کہ نواب حافظ رحمت خان والی روہیلکھنڈ کے پوتے نواب عبد العزیز خان کو زیور علم سے آراستہ فرمایا، نواب صاحب آزاد منش تھے اور علم و عمل سے ان کو کوئی مطلب نہ تھا، لیکن حضرت مفتی صاحب کی برکت سے ایسا آزاد شخص بھی فیضیاب ہو کر عالم باعمل بن گیا،

حضرت استاذ العلما، فرماتے "ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ کی طبیعت بہت شگفتہ تھی، ایک بار عربی مین صنعت اہمال یعنی غیر منقوط عربی بولنے اور لکھنے کی جانب میلان ہوا، بلا تکلف جملون کے جملے اور عبارتین کی عبارتین بولتے اور لکھتے چلے جاتے، ایک مرتبہ کسی جگہ کچھ لوگ اس مصرعہ کی خوبی سے لطف لے رہے تھے اور تضمین کے لیے کوشان، مگر سمجھ کام نہیں کر رہی تھی، اتنے مین حضرت تشریف لائے

پوچھا کیا ہو رہا ہے، مصرعہ سنتے ہی برجستہ تضمین فرمادی جس پر سارے حاضرین دنگ رہ گئے، مصرعہ یہ تھا،

سحر بر خاتم از خواب دبوسیدم در خود را

مفتی صاحب نے پہلا مصرعہ یون فرمایا:-

بشب در خواب دیدم بر در خود دلبر خود را

باتین لکھنے کو بہت ہین جن سے بوجب ہواللسنت ماکی رتہ یتضوع لطف اندوز ہو رہا ہون اور قلم رکنا بھی نہین چاہتا، مگر اب یہ شعر پڑھتے ہوئے زبردستی کرکے قلم کو روکتا ہون،

اندکے باتو بگفتم وبدل ترسیدم کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

دار المصنفین کی ایک نئی کتاب

اہل کتاب صحابہؓ وتابعینؒ

جس مین ترانوے ۹۳ ایسے صحابہؓ، صحابیات، تابعین اور تابعاتؒ کے سوانح اور کارنامے درج ہین، جو مذہباً یہودی اور نصرانی تھے، اور مشرف باسلام ہوئے، شروع مین ایک مقدمہ ہے، جس مین جزیرۂ عرب مین یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ، ان کے تمدنی و سیاسی اثرات اور ان کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

قیمت :- للعہ

(مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین)

منیجر

مطبوعات جدیدہ

دور حاضر اور اردو غزلگوئی از ڈاکٹر عندلیب شادانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور نفیر روڈ کراچی،

عرصہ ہوا مصنف نے رسالہ ساقی دہلی مین اردو شاعری کے عیوب و نقائص پر ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا، جس کو اب کتابی صورت مین شائع کر دیا ہے، اس تنقید مین انھون نے اردو غزل کی تنگ دامانی اس کے خیالات و مضامین کی فرسودگی و رکاکت، ردیف و قافیہ کی پابندیون کے نقصانات، صوفیانہ و فلسفیانہ خیالات کے نقائص اور بعض مخصوص الفاظ مثلاً (۱) تیر و پیکان، خنجر و شمشیر، قتل و خون، نزع و مرگ، قبر و حشر، جفائے محبوب، لیلیٰ مجنون، (۲) زاہد و واعظ، محتسب و ناصح، اشک خونین، آفتاب و ذرہ، دل و جگر، شمع و پروانہ وغیرہ کی کثرت و تکرار اور ان سے پیدا شدہ مضامین کے ابتذال اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات کو جو تجدد پسند طبقہ کی جانب سے عموماً کئے جاتے ہین، کچھ اور اضافون کے ساتھ دہرا دیا ہے، اور اس سلسلہ مین قدیم اساتذہ سے لے کر موجودہ دور تک کے شعراء کو لے ڈالا ہے خصوصاً اصغر، جگر، فانی، حسرت اور فراق وغیرہ کی شاعری کے بخیے ادھیڑے ہین قدیم تغزل کے معائب سے انکار نہین، مصنف کے بیان کردہ اکثر نقائص اس مین پائے جاتے تھے، مگر اب زمانہ کا مذاق بہت کچھ اون کی اصلاح کر چکا ہے، اور اس کا رنگ ہی یکسر بدل گیا ہے، اور اس مین اتنی ترقی ہو چکی ہے، کہ اس کے بعد مشکل ہی سے ترقی کا کوئی درجہ تصور کیا جا سکتا ہے، اس لئے اب اُن اعتراضات کو دہرانا محض پرانی لکیر کو پیٹنا ہے، اگر

یہ مضمون آج سے نصف صدی پیشتر لکھا جاتا، تو اس کی کچھ قدر و قیمت بھی ہوتی، مگر اس زمانہ مین اس کی حیثیت گڑے مردے اکھیڑنے سے زیادہ نہین، اگر نئے دور کے کسی صاحب کمال غزل گو کے کلام مین پرانے رنگ کے کچھ اشعار یا بعض خامیان نکل آئین، تو اس سے نہ اس کے کمال شاعری پر حرف آتا ہے اور نہ جدید تغزل کے پورے دفتر کو مطعون کیا جا سکتا ہے، کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ اکثریت اور کلیات کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، اقلیت اور مستثنیات سے نہین، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جدید طرز تغزل بڑی حد تک پرانی غزل گوئی کی خامیون سے پاک اور اس سے بمراحل بلند اور پاکیزہ ہے، پھر یہ بھی بحث طلب ہے کہ مصنف نے تغزل کا جو معیار قائم کیا، وہ خود کہان تک صحیح اور قابل قبول ہے، اور خود ان کا کلام کہان تک اس معیار کے مطابق ہے، مصنف کی یہ تنقید یک طرفہ اور غیر منصفانہ ہے، انھون نے موجودہ تغزل کی خوبیان بالکل نظرانداز کر دی ہین، اور کسی شاعر کے دو چار اشعار لے کر جن پر اُن کے نقطۂ نظر سے اعتراض کا کوئی پہلو نکل سکتا تھا، پوری صنف تغزل کو نشانۂ ملامت بنا دیا، اس قسم کے اعتراضات کی حیثیت سے "خردہ گیری" سے زیادہ نہین ہے، اور ان مین سے اکثر غلط ہین، مثلاً نمبر ۱ کے الفاظ اور ان سے پیدا شدہ مضامین پر اعتراضات تو ایک حد تک صحیح ہین، مگر نمبر ۲ کے الفاظ کے اعتراضات بڑی حد تک غلط ہین، ان الفاظ نے تو بلند اور رنگ رنگ مضامین کا ایک عالم پیدا کر دیا ہے، جن کو ناقد نے عمداً نظرانداز کر دیا ہے، ایک طرف تو ان کا معیار اتنا بلند ہے کہ ان کو اردو شاعری کا سارا دفتر ہی بے معنی نظر آتا ہے، دوسری طرف صوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین کو بھی جنھون نے مسلمہ طور پر اردو شاعری کا پایہ بہت اونچا کر دیا ہے، اس کا عیب و نقص شمار کرتے ہین، افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرہ مین اس کتاب پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجائش نہین ہے، ورنہ دکھایا جاتا کہ فاضل ناقد نے اس تنقید مین کس قدر مبالغہ، زیادتی اور مغالطہ سے کام لیا ہے، تاہم وہ ایک خوش مذاق ادیب اور صاحب نظر نقاد ہین اور ہمارا خیال ہے کہ اُن کی اس تنقید کا مقصد واقعی اصلاح سے زیادہ "ادبی سخن خیزی" ہے، اس لئے اُن کے

فہم سے بہت سی مفید اور کام کی باتین بھی نکل گئی ہین، جو ہمارے بعض علماء و شعراء کے لئے لائق غور ہین، اور ادبی تنقیدی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہین ہے،

اسلام کا نظام مساجد از جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانخہ

تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت، طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ ر، غیر مجلد ہے ر، پتہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی،

مسجدین مسلمانون کی عبادتگاہ بھی ہین، دینی تعلیم و تربیت کی درسگاہ بھی اور نظام اجتماعی کا مرکز بھی، اور قرون اولی اور اس کے بعد ہر زمانہ کے صلحاء و اخیار نے مساجد کی ان تمام حیثیتون کا پورا لحاظ اور اہتمام رکھا، مگر اس زمانہ مین جب کہ عام طور سے نماز اور جماعت ہی کی جانب سے بے توجہی ہے تو دوسرے امور کا کیا ذکر، اس لئے مصنف نے مساجد کی اہمیت اور اس کی مختلف حیثیتون پر یہ کتاب لکھی ہے، اس مین انھون نے انکی غرض و غایت، اُن کی مختلف حیثیتون اور ان کے دینی مقاصد اور اجتماعی فوائد وغیرہ مساجد سے متعلق جملہ امور و مسائل بڑی تفصیل اور بسط و شرح کے ساتھ تحریر کئے ہین، کتاب کے شروع مین مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد قبا اور مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ اور اُن کے فضائل لکھے ہین، اس کے بعد مختلف ابواب مین مساجد کی دینی و اجتماعی اہمیت، اُن کی مرکزی حیثیت، اُن کے نظام اجتماعی، نماز باجماعت کی اہمیت و تاکید، جمعہ و عیدین کی اہمیت، اُن کے حکم و مصالح اور دینی، اخلاقی اور اجتماعی فوائد، اذان و امامت کی اہمیت اور اُن سے متعلق احکام و مسائل، مساجد کے فضائل و برکات، اُن کی تعمیر اور تزئین و آرائش، اُن کے آداب ممنوعات و مستحبات، مساجد کی صفائی، اُن سے متعلق اوقاف و تولیت وغیرہ کے مفصل احکام و مسائل بیان کئے ہین، مباحث کی تفصیلات کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اردو مین اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب موجود نہین ہے، یہ مساجد کے متعلق جملہ احکام و مسائل پر پوری طرح حاوی ہے اور اپنے معلومات اور فوائد کے لحاظ سے مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

اسلامی ڈرامے از جناب اسلیم صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت نفیس، قیمت مجلد ے ر، پتہ گوشۂ ادب چوک انارکلی، لاہور۔

مصنف نے ان ڈراموں میں تاریخ اسلام کے پانچ اہم معرکوں حضرت خالد بن ولید کی فتح شام، طارق بن زیاد کی فتح اندلس محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور سلطان عماد الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کی بعض صلیبی محاربات، مجاہدین کے جوش جہاد، ان کی شجاعت و بسالت ان کے اخلاق و سیرت کی بلندی اور ان کے حریفوں کی بزدلی، اور اخلاقی پستی کے واقعات کو ڈرامے کی شکل میں لکھا ہے، اگرچہ ان واقعات میں ڈرامائی اجزاء کی تکمیل کے لئے بعض جزوی اضافے بھی ہیں مگر اصل واقعات تاریخی حیثیت سے بالکل صحیح ہیں قومی و ملی جوش و ولولہ پیدا کرنے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اس قسم کے ڈرامے بہت مفید ہیں، اگر ڈرامے کی اثرانگیزی کے لئے زبان پر قدرت اور تحریر میں زور و قوت بہت ضروری ہے، ورنہ ڈرامے اور عام نثر میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے، مگر ان ڈراموں میں ادبی حیثیت سے بہت سی خامیاں ہیں، جس سے ان کے حسن اور اثر میں فرق آگیا ہے، تاہم وہ آج کل کے بے مقصد اور تفریحی بلکہ تخریبی ڈراموں سے بہت بہتر اور مسلمان نوجوانوں کے پڑھنے کے لائق ہیں،

اشعار اکبر از جناب سید حسن صاحب پروفیسر پٹنہ کالج، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ ۱۲ ر، پتہ:- اقبال بک ڈپو مقابل پٹنہ کالج پٹنہ نمبر ۴،

مصنف نے اس کتاب میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کے مختصر سوانح، ان کے اخلاق و سیرت اور ان کے دور کے سیاسی حالات اور اس کے اثرات و نتائج تحریر کئے ہیں، اور کلام اکبر کا تجزیہ کرکے جامعیت و اختصار کے ساتھ اس کے تمام اہم پہلوؤں کو دکھایا ہے، اور اس کے نمونے پیش کئے ہیں، جس سے حضرت اکبر کے شاعرانہ کمالات اور کلام اکبر کی شعری خصوصیات اور اصلاحی اہمیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کلام اکبر اور اس کے پس منظر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور کتاب سلیقہ اور خوش مذاقی سے لکھی ہے، "م"

جلد ۶۹ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۴۲-۲۴۴

مقالات

یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ	مولانا عبد السلام ندوی	۲۴۵-۲۵۷
اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۲۵۸-۲۸۳
قائم چاندپوری اور ان کا کلام	جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری	۲۸۴-۲۹۷
روحانی دنیا	جناب مولوی عبد الماجد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز بہار پٹنہ،	۲۹۸-۳۰۷
مرزا مظہر جان جاں کی دو غزلیں	جناب پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب کاکوی	۳۰۸-۳۱۶
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۱۷-۳۲۰